قدم قدم بلائیں
عامر عثمانی

انتساب

قدردانِ عامر عثمانیؒ
کے نام

یہ قدَم قدَم بلائیں، یہ سوادِ کوئے جاناں
وہ یہیں سے لوٹ جائے، جسے زندگی ہو پیاری

ترتیب

قطعات

مولانا عامر عثمانیؒ

ماہرالقادریؒ، ایڈیٹر فاران، کراچی

مولانا عامر عثمانی سے پاکستان بننے کے بعد کراچی میں ملاقات ہوئی اور پہلی ہی ملاقات میں ایسا محسوس ہوا جیسے ہم دونوں ایک دوسرے کی صورت دیکھنے سے قبل بھی دوست تھے۔ دیوبند سے وہ کراچی اپنے والدین اور بھائیوں سے ملنے کے لیے کئی بار آئے۔ اور ان سے مسلسل ملاقاتوں کے بعد بھی سیری نہیں ہوئی، تشنگی باقی رہی'! مولانا عامر عثمانی اور راقم الحروف کے درمیان نسل و رنگ اور قوم و وطن کا نہیں دین کا رشتہ تھا۔ اس رشتہ سے زیادہ قوی و مستحکم کوئی دوسرا رشتہ نہیں! جو وہ سوچتے اور لکھتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میرے خیالات لڑ گئے ہیں اور میرے محسوسات کا توارُد ہو گیا ہے۔ افکار و خیالات میں اس قدر ہم آہنگی اور یک رنگی کم ہی دیکھنے میں آئی ہے۔

مگر یہ دنیا ہے جس میں انتہائی مخلص دوستوں، عزیزوں اور مخلص خیر خواہوں سے بھی اختلاف کے موقعے آجاتے ہیں۔ مشہور ناصبی العقیدہ اہلِ قلم محمود عبّاسی کے موقف کی تائید میں جو تحریریں ماہنامہ "تجلّی" میں شائع ہوئیں تو مولانا عامر عثمانی کے اس موقف پر راقم الحروف کو حیرت بھی ہوئی اور وجدان نے اذیّت بھی محسوس کی، میں نے ان کو کئی خط بھی لکھے اور "فاران" میں بھی عامر عثمانی کی تحریروں پر نقد و احتساب کیا۔ میرے لیے یہ شدید مرحلہ تھا، ایک طرف گہری دوستی، مخلصانہ روابط اور برادرانہ تعلّقات تھے اور دوسری طرف اظہارِ حق کے تقاضے تھے۔ میں سکوت بھی اختیار کر سکتا تھا لیکن دوست کی

رو رعایت کے لیے ضمیر کی آواز کو دبانا میرے بس کی بات نہ تھی۔ راقم الحروف نے وہی بات کہی جو اس کے نزدیک حق تھی۔

پھر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے قبولِ حق کے لیے ان کا سینہ کھول دیا، حق اُن پر چڑھتے ہوئے سورج کی طرح واضح ہو گیا۔ عامر عثمانی نے اپنے موقف سے رجوع کر کے محمود عباسی کی کتابوں پر اس قدر مدلل جرح و تنقید کی کہ پڑھنے والے عش عش کرنے لگے! بھارت میں جن نامی گرامی علماء نے مولانا مودودیؒ کی "خلافت و ملوکیت" کو طنز و تنقید کا ہدف بنایا اور مولانا موصوف پر اہانتِ صحابہؓ کا جھوٹا الزام لگایا تھا، ان کی تحریروں اور کتابوں کے مولانا عامر عثمانی نے دلیل و برہان کی تیغِ بُرّاں سے پرخچے اڑا دیے۔
دار العلوم دیوبند کی مجلسِ شوریٰ کے رُکن اور جمعیۃ علماءِ ہند کے صدر مولانا محمد میاں کی کتاب "شواہدِ تقدّس"، کا ماہنامہ "تجلّی" میں اسقدر مہارت و بصیرت کے ساتھ پوسٹ مارٹم کیا گیا کہ یہ کتاب (شواہدِ تقدّس) شواہدِ جہالت نظر آنے لگی! تنہا اس شخص نے دیوبند میں رہ کر، جماعتِ اسلامی کی مخالفت کے طوفان کا مُنہ پھیر دیا ہے اور جنبشِ تحریکِ اسلامی کے اس اکیلے سپاہی نے جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودیؒ کے مخالفین و معاندین کی پلٹن کا مقابلہ کیا ہے!

راقم الحروف اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر، آخرت کی جواب دہی کے احساس کے ساتھ اس حقیقت کا اظہار کر رہا ہے کہ مولانا عامر عثمانی نے بڑے بڑے علماءِ دین جن کے علم و فضل کے ڈنکے بج رہے ہیں ان کی کتابوں اور تحریروں پر خالص علمی اور فقہی انداز میں جب گرفت کی ہے تو مرحوم کی تنقید پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوا ہے کہ یہ علماء علم ہی نہیں عقل و بصیرت سے بھی کورے ہیں۔

مولانا عامر عثمانی رح کا مطالعہ بحرِ اوقیانوس کی طرح عریض و طویل اور عمیق تھا۔ وہ جو بات کہتے تھے کتابوں کے حوالوں اور عقلی و فکری دلائل و براہین کے ساتھ کہتے تھے۔

یہ قدم قدم بلائیں

پھر سونے پر سہاگا زبان وادب کی چاشنی اور سلاست ورعنائی۔ تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، لغت وادب غرض تمام علوم میں مولانا عامر عثمانی کو قابلِ رشک بصیرت حاصل تھی۔ جس مسئلہ پر قلم اُٹھاتے اس کا حق ادا کردیتے۔ ایک ایک جزیئہ کی تردید یا تائید میں اُمّہات الکتب کے حوالے پیش کرتے، علمی اوردینی مسائل میں ان کی گرفت اتنی سخت ہوتی کہ بڑے بڑے چغادری اور اہلِ قلم پسینہ پسینہ ہوجاتے! انھیں اپنی رائے اور فکر پر، مطالعہ اور استدلال پر پورا اعتماد تھا اس لیے ہر عالم اور مفکّر سے بلند و بالا ہوکر اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے! راقم الحروف ان کی تحریر کا ایک ایک لفظ پڑھتا اور پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا کہ میں نے بہت کچھ حاصل کیا۔ مولانا عامر اپنی ذات سے دبستانِ علم وفضل تھے۔

مولانا عامر عثمانی رح کے فقہی جوابات میں ناول جیسی ادبی دلچسپی اور زبان کی چاشنی ہوتی کیسے کیسے نازک مسائل کی مرحوم نے کس حذاقت و مہارت کے ساتھ گرہ کُشائی کی ہے! "مسجد سے میخانے تک" ماہنامہ "تجلّی" کا مستقل عنوان تھا۔ اس میں مزاح وظرافت کا وہ چٹخارہ کہ:

قند ذائقہ در موجِ کوثر و تسنیم

مزاح وظرافت کا مقصد لوگوں کی تفریح طبع اور ہنسنا ہنسانا نہیں بلکہ عبرت و موعظت کا درس دینا تھا! ان چٹکیوں اور گدگدیوں میں وہ بڑے کام کی باتیں کرجاتے

دارالعلوم دیوبند میں ماہنامہ "تجلّی" پر قدغن تھی مگر نہ جانے کتنے طلبہ چُھپ چُھپاکر "تجلّی" کا مطالعہ کرتے! مولانا عامر عثمانی مرحوم دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل اور اکابرِ دیوبند کے عقیدت مند تھے مگر لکیر کے فقیر نہ تھے! دیوبند کے متوسّلین اپنے اکابر کی عقیدت میں جو غلو کرتے ہیں مولانا عامر اس سے محفوظ تھے اور اپنے بڑوں کی غلطیوں کی تائید اور تاویل نہیں کرتے تھے، اگر دیوبندی حضرات مولانا عامر عثمانی کی روش اختیار کرتے تو دیوبند کی مخالفت میں "زلزلہ" نام کی کتاب وجود

میں نہ آتی۔

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ مولانا عامر عثمانی کے عمِّ محترم تھے۔ ان کے والد حضرت مولانا مطلوب الرحمٰن قدّس سرّہٗ حضرت شیخ الہند رحؒ سے بیعت تھے۔ مگر عامر عثمانی رحؒ کو پیری مُریدی سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا۔ تجلّی میں عجمی تصوّف پر خوب کس کر تنقید کرتے رہتے تھے۔ شرک و بدعت کی تردید اور توحید و سُنّت کی تبلیغ و اشاعت ان کا سب سے زیادہ محبوب مشغلہ تھا۔ انھوں نے ہزاروں صفحے شرک و بدعت کی تنقیص و تردید میں لکھے ہیں اور مشرکانہ عقائد و رسوم کے ایک ایک جزئیہ پر احتساب کیا ہے، اس میدان میں وہ ہر وقت شمشیر برہنہ رہتے تھے! اُن کے مفاخر و حسنات کا سب سے روشن باب شرک و بدعت کے خلاف قلمی جہاد ہے، جس کا آخرت میں ان شاء اللہ العزیز اجرِ غیر ممنون انھیں ملے گا۔

اس تمام علم و فضل اور ذہانت و بصیرت کے باوجود مولانا سیّد ابوالاعلےٰ مودودی رحؒ کے انتہائی قدر شناس، عقیدت مند اور مدّاح تھے۔ مولانا مودودی کو وہ امامُ العصر اور مجتہدِ وقت بلکہ اس دور کا مجدّد سمجھتے تھے۔ مولانا مودودی رحؒ کی مدافعت میں وہ ہر محاذ پر سینہ سپر نظر آتے تھے۔

"فاران" میں کتابوں پر جس انداز میں نقد و تبصرہ کیا جاتا ہے' یہ انداز کئی رسالوں نے اختیار کیا مگر وہ اسے نباہ نہ سکے۔ مولانا عامر عثمانی رحؒ نے "تجلّی" میں اس انداز کو پوری طرح برقرار رکھا، شعر و ادب اور زبان پر "فاران" کی تنقیدیں "تجلی" کی تنقیدوں سے شاید کچھ نکلتی ہوئی ہوں، مگر علمی مباحث اور کتابوں پر "تجلّی" کی تنقیدوں کا جواب نہیں! یہ مولانا عامر عثمانی کا حصّہ تھا، جہاں تک علم و فضل کا تعلّق ہے راقم الحروف کی ان کے سامنے کوئی حیثیت نہیں تھی۔

اب سے تقریباً بائیس برس قبل مولانا عامر عثمانی کراچی تشریف لائے تو

ان کی زبان سے اس قسم کی غزلیں:

یہ قدم قدم بلائیں ، یہ سوادِ کوئے جاناں

وہ یہیں سے لوٹ جائے، جسے زندگی ہو پیاری

سُن کر بڑی مسرّت ہوئی، پھر انھوں نے "تجلی" میں ابوالاثر حفیظ جالندھری کے شاہنامہ کی بحر اور انداز پر سیرت النبیؐ کے منظوم واقعات کا سلسلہ شروع کیا، جو خوب تھا اور اُسے پسند کیا گیا! پھر ایک ایسا دور بھی آیا کہ ان کی شاعری کا شوق بجھ سا گیا، اس پر میں نے ان کو لکھا کہ شعر کہنا ترک نہ کیجیے، اللہ تعالیٰ نے شعر گوئی کی جو صلاحیت آپ کو دی ہے اسے کام میں لائیے۔

پاکستان اور ہندوستان کے مابین برسوں سے ڈاک بند رہنے کے بعد جو ڈاک کھلی تو مولانا عامر عثمانی سے مراسلت کا موقع ملا انھوں نے اپنے کئی قطعے بھیجے، اور اپنی شاعری کے بارے میں میری رائے دریافت کی، میں نے انھیں جواب میں لکھا کہ فلاں فلاں مصرعوں کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوا کہ آپ کو بھی "ترقی پسند شاعری" کی برائے نام ہی سہی جھپٹ لگ گئی ہے۔ ایک دو مصرعوں کا تجزیہ بھی میں نے کیا کہ ان میں یہ مقامات محلِّ نظر ہیں، میری تنقید و مشورت کا انھوں نے بُرا نہیں مانا۔

عجب واقعہ ہے کہ یا تو وہ ایک زمانے میں شاعری سے بے تعلق ہو گئے تھے مگر کئی برس سے شعر گوئی کا شغف بڑھ گیا تھا۔ کوئی شک نہیں وہ نغز گو شاعر تھے! کئی مہینے ہوئے میرے پاس اُن کا خط آیا کہ مہینہ بھر صوبہ مدراس کے مختلف شہروں کا سفر کیا، ہر جگہ مشاعرے پڑھے پانڈیچری اور کیرالہ بھی ہو آیا۔ جس دینی مشن کے وہ مبلغ تھے اور ان کو علم و فضل کا جو بلند مقام حاصل تھا اس کے دیکھتے ہوئے مولانا عامر عثمانی کی مشاعروں میں مسلسل شرکت ان کے نیاز مندوں کی

نگاہ میں قدرے محسوس ہوئی وہ " ماہر القادری" نہیں "مولانا عامر عثمانی" تھے۔

پونا کے جس مشاعرے میں شعر پڑھتے ہوئے ان کا انتقال ہوا ہے۔ اس مشاعرے اور ہندوستان کے متعدّد شہروں کے مشاعروں کی دعوت راقم الحروف کو ملی تھی۔ اُدھر سے اصرار کی کوئی حد و نہایت ہی نہ رہی، خطوط ہی نہیں تار بھی آئے، فون پر بھی بمبئی سے گفتگو ہوئی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ نے بستر علالت سے دو خط لکھے کہ خدا کے لیے کسی طرح آجاؤ! مگر میرا جانا نہ ہو سکا! روزنامہ "دعوت" دہلی میں "مولانا عامر عثمانی کے آخری چند دن" کے عنوان سے جناب محمد داؤد (نگینہ) نے ایک مضمون قلم بند کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"مولانا (عامر عثمانی) تین روز تک برابر خاموش پڑے رہے... پھر آہستہ آہستہ افاقہ ہونے لگا، آپ نے گھر والوں سے اور ڈاکٹروں سے اپنے بمبئی جانے کے ارادے کا اظہار کیا، ڈاکٹروں نے کہا کہ ہم اتنے طویل سفر کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتے۔ آپ کو مسلسل آرام کی ضرورت ہے۔ اس پر مولانا نے کہا کہ اچھّا اجازت نہیں دیتے تو بغیر اجازت ہی چلا جاؤں گا۔ گھر کے لوگوں نے جب آپ کو اس سفر سے باز رکھنا چاہا تو آپ نے بڑے پُر اعتماد لہجے میں کہا میں وہاں ضرور جاؤں گا، میرا بچپن[1] کا دوست ماہر القادری آرہا ہے اس سے ملنے کو میرا بے انتہا دل چاہتا ہے........"

جماعتِ اسلامی مہاراشٹر کے رُکن جناب عبدالرحمٰن صاحب کا میرے نام بمبئی

---

[1] مولانا عامر عثمانی مرحوم نے "بچپن" نہیں کہا ہوگا، وہ مجھ سے عمر میں بہت چھوٹے تھے اور ان سے پہلی بار ملاقات کراچی میں پاکستان بننے کے تین چار برس بعد ہوئی تھی۔ (م۔ق)

سے جو خط (مورخہ ۱۴/اپریل) آیا ہے اس میں صاحبِ موصوف نے لکھا ہے:

"ایک جانکاہ خبر سنانے جا رہا ہوں جس کے لیے نہ دل آمادہ ہے نہ قلم چل رہا ہے لیکن مشیّتِ ایزدی کے آگے ہم بے بس ہیں، مولانا عامر عثمانی صاحب کا پرسوں شب میں پونہ میں انتقال ہوگیا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

انجمن خیر الاسلام کے ایشیائی مشاعرے میں شرکت کی غرض سے بمبئی تشریف لائے تھے، مشاعروں سے مرحوم کو کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، لیکن چوں کہ آپ بھی شریک ہونے والے تھے لہٰذا آپ سے ملاقات کی شدید خواہش کے پیشِ نظر گزشتہ ماہ جب وہ بمبئی تشریف لائے تو ہم لوگوں سے فرمایا تھا کہ اس ایشیائی مشاعرے میں انھیں مدعو کیا جائے تو اچھا ہے۔ چنانچہ بڑی کوششوں کے بعد ان کو دعوت نامہ جا سکا، کسے معلوم تھا کہ یہ بلاوا اصلاً اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہوا ہے، پندرہ بیس روز قبل دل کا ایک دورہ پڑ چکا تھا۔ ۲۴ گھنٹے بیہوش رہے اور ابھی صحت بمبئی کے سفر کی متحمّل نہیں تھی، مگر آپ سے اور دیگر رفقا سے ملاقات کے شوق میں چلے آئے، احتیاطاً اپنے برادرِ نسبتی کو ساتھ لے لیا تھا۔ ۱۱/اپریل کو صابو صدّیق ٹکنک گراؤنڈ پر کلام بیٹھ کر سُنایا، کچھ بدعتی حضرات نے ہوٹنگ کر دی۔ اس کے بعد مرحوم اسٹیج سے اُٹھ گئے، ہم لوگ بھی اُن کے ساتھ نکل آئے۔ ڈاکٹر عبدالکریم نائک صاحب نے ایک مشہور CARDIOLOGIST کے نام چٹھی لکھ کر مجھے دی کہ دوسرے دن میں وہاں لے جا کر معائنہ و علاج کراؤں۔

لیکن دوسرے دن منتظمینِ مشاعرہ اصرار کر کے انھیں پونہ کے

مشاعرے میں لے گئے جہاں مرحوم نے کلام سُنایا۔ خوب داد حاصل کی، کلام سُنا کر بیٹھے اور برادرِ نسبتی کے زانو پر سر رکھ کر ابدی نیند سو گئے! ڈاکٹر نائک صاحب وہاں موجود تھے فوراً کار میں لے کر بمبئی روانہ ہو گئے۔ یہاں سے ہم نے دیوبند ٹرنک کال لگائی لیکن کامیابی نہیں ہوئی، امیر جماعت اور مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے مشورے سے بمبئی میں تدفین کر دی گئی، مفتی صاحب ہمارے فون کے فوراً بعد بذریعۂ کار دیوبند تشریف لے گئے، ہم نے تو ہوائی جہاز کے ذریعہ میت بھیجنے کے انتظامات کر لیے تھے لیکن مفتی صاحب کے مشورے کو ترجیح دی گئی۔

"مرحوم کو آپ سے خصوصی تعلق تھا پچھلی بار بمبئی تشریف لائے تو بڑے شوق سے آپ کا تذکرہ فرما رہے تھے۔ آپ کے اس مشورے کا بھی تذکرہ کیا جو آپ نے انھیں شاعری کا نہ چھوڑنے کے سلسلہ میں دیا تھا۔ جماعتِ اسلامی کے تعلق سے پاکستان میں آپ نے جس محاذ کو سنبھالا ہے اس محاذ پر ہندوستان میں مرحوم جو کٹھی لڑائی لڑ رہے تھے۔ اس لحاظ سے جماعت کا بڑا نقصان ہوا۔ مرحوم کے قلم میں جو روانی، تیزی اور منطقی انداز تھا وہ بے مثل ہے، اللہ تعالیٰ نعم البدل عطا فرمائے، اُن کی حسنات کو قبول فرمائے اور لغزشوں سے درگزر......"

یہ اللہ تعالیٰ کا محض فضل و کرم ہے کہ مجھ جیسے معمولی حیثیت اور سطحی استعداد کے شخص کی اتنے بڑے لوگوں کے دل میں اتنی محبت ڈال دی گئی ہے!

بعض اشعار اور ضرب الامثال رسمی طور پر ہر لکھے پڑھے اور عالم کے لیے لکھ دیے جاتے ہیں مگر مولانا عامر عثمانی کی موت فی الحقیقت "موتُ العالِم موتُ العالَم"، کی صحیح مصداق ہے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

("فاران"، جون ۱۹۷۵ء)

یہ قدم قدم بلائیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قادرِ مُطلق کی بارگاہ میں

یہ جانتا ہوں کہ کچھ نہیں ہے متاعِ علم و کمال میری
مگر یہ ہے تیری دسترس میں خذف کو موتی کا رنگ دیدے

عروج آئے وہ پستیوں پر بلندیاں بھی عرق عرق ہوں
خزاں کی ویران وسعتوں کو بہار کا جلترنگ دیدے

نعت

یہ قدم قدم بلائیں
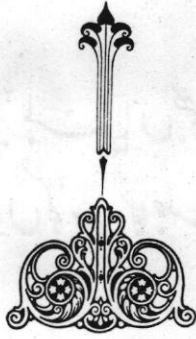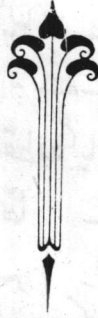
تمھاری نعت کے قربان جان و دل لیکن
تمھاری نعت کے قابل کہاں زبان و قلم
قلم کی نوک پہ الفاظ تو بہت ہیں مگر
ثبوتِ صدقِ معانی کریں کہاں سے بہم
چڑھی ہوئی ہیں زباں پر کثافتوں کی تہیں
پھر اس زبان سے کیسے تمھاری نعت کہیں

بس ایک رسم ہے جس کو نباہنے کے لیے
تکلفات سے بزمِ سخن سجانی ہے
ہمارا شعر کہاں دولتِ خلوص کہاں
سخن فروش ہیں دادِ ہنر کمانی ہے
نہ سوز و ساز ہے دل میں نہ آنکھ میں آنسو
کھلے ہوئے ہیں عقیدت کے پھول بے خوشبو

زباں پہ دعویٔ مہر و وفا بہت کچھ ہے
سجی ہوئی ہے درود و سلام کی محفل
مگر دلوں میں غمِ آخرت کا نام نہیں
غمِ حیات کی چوکھٹ پہ سجدہ ریز ہیں دل
جمی ہوئی ہیں نگاہیں نشاطِ حاضر پر
نہ باز پرس کا خطرہ نہ احتساب کا ڈر

وہ تم کہ شکرِ سراپا تھے اپنے رب کے لیے | یہ ہم کہ شکر گزاری سے واسطہ ہی نہیں
وہ تم کہ حق کے لیے سر بکف تھے میداں میں | یہ ہم کہ زخم کے کھانے کا حوصلہ ہی نہیں

تمھیں عزیز تھی ہر شے سے عزتِ اسلام
ہمارے پاس فقط رہ گیا خدا کا نام

بُتانِ قوم و وطن جن کو تم نے توڑا تھا | نئے سرے سے انھیں ہم نے پھر تراش لیا
کیا تھا تم نے اُخوّت کا جو محل تعمیر | اسے نفاق کی ضربت سے ہم نے توڑ دیا

ہماری ظلمتِ شب میں کہیں بھی نور نہیں
طلوعِ صبح کے آثار ــــ دور دور نہیں

ہمیں تمھاری غلامی پہ فخر ہے لیکن | بُھلا دیا کہ غلامی کا مدّعا کیا ہے
وفا کو ایک تخیّل بنا لیا ہم نے | ہمیں شعور نہیں مقصدِ وفا کیا ہے

طلب تصوّرِ منزل سے ہو چکی محروم
خود اپنی سمتِ سفر بھی ہمیں نہیں معلوم

حضور! پھر بھی یہ اشعار پیشِ خدمت ہیں | اگرچہ ہدیۂ ناچیز، کم عیار سہی
برائے نام سی نسبت تو تم سے باقی ہے | ہزار دامنِ ایمان تار تار سہی

تمھارا نام ہے تسکینِ روح و جاں اب بھی
تمھاری یاد سے ہوتا ہے دل جواں اب بھی

غزلیں

یہ قدم قدم بلائیں
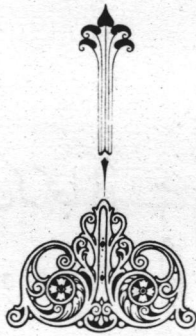
یہ کم نہیں کہ بجھائی ہے پیاس کانٹوں کی
بلا سے راہِ وفا میں لہُو لہُان ہوئے

نہ سکت ہے ضبطِ غم کی، نہ مجالِ اشکباری
یہ عجیب کیفیت ہے نہ سکوں نہ بے قراری

ترا ایک ہی ستم ہے ترے ہر کرم پہ بھاری
غمِ دوجہاں سے دے دی مجھے تو نے رستگاری

مری زندگی کا حاصل ترے غم کی پاسداری
ترے غم کی آبرو ہے، مجھے ہر خوشی سے پیاری

یہ قدم قدم بلائیں یہ سوادِ کوئے جاناں
وہ یہیں سے لوٹ جائے جسے زندگی ہو پیاری

ترے جاں نواز وعدے مجھے کیا فریب دیتے
ترے کام آگئی ہے مری زُود اعتباری

مری رات منتظر ہے کسی اور صبحِ نو کی
یہ سحر تجھے مبارک جو ہے ظلمتوں کی ماری

وہی پھول چاک دامن، وہی رنگِ اہلِ گلشن
ابھی صرف یہ ہوا ہے، کہ بدل گئے شکاری

مری عافیت کے دشمن، مجھے چین آ چلا ہے
کوئی اور زخمِ تازہ، کوئی اور ضرب کاری

مجھے لے چلا بہا کر — غمِ زندگی کا دھارا
غمِ عشق یاوری کر، ہے مقامِ شرمساری

جو غنی ہو ماسوا سے وہ گدا گدا نہیں ہے
جو اسیرِ ماسوا ہو — وہ امیر بھی بھکاری
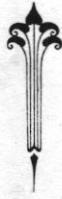
چشمِ باطن کو بروئے کار جب لاتا ہوں میں
وہ کہیں بھی ہوں نظر کے سامنے پاتا ہوں میں

اس لیے ہر ظلم خاموشی سے سہ جاتا ہوں میں
یہ نہ سمجھیں وہ کہ ان کے غم سے گھبراتا ہوں میں

فکرِ دُنیا ہو، غمِ عقبیٰ ہو، دردِ عشق ہو
غم کا ہر نغمہ رُبابِ عشق پر گاتا ہوں میں

مرحبا! اے کوششِ ضبطِ مسلسل مرحبا
آج ان کو آرزو مندِ فغاں پاتا ہوں میں

اب تو عالم میں ہوں اور اک جستجوئے ناتمام
بے خودی میں خود ہی کھو دیتا ہوں جو پاتا ہوں میں

جینا بھی اسی کا حق ہے جسے، مرنے کا سلیقہ آتا ہے
جو مرنے سے گھبراتا ہے، وہ جیتے جی مرجاتا ہے

بے سوز و تپش، بے درد و خلش، ہے عمرِ اَبَد بھی لاحاصل
آغاز وہی ہے جینے کا، جب دل کو تڑپنا آتا ہے

جو پاک خدا کے بندوں پر، کرتے تھے خدائی کے دعوے
اب ان کا سفینہ اپنے ہی، دریا میں تھپیڑے کھاتا ہے

وہ دیکھ! اُفق سے آگ اُٹھی، بادل گرجا، طوفاں آئے
وہ دیکھ! نظامِ کہنہ کو، کِس رنگ سے بدلا جاتا ہے

تھا وہ بھی زمانہ اے عامرؔ! بازو تھے ہمارے تیغ و سناں
اب تیغ و سناں کی صورت کو دیکھے سے پسینہ آتا ہے
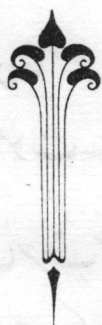
موسمِ گل کو کیا کریں دل میں شگفتگی نہیں
فرصتِ زندگی تو ہے خواہشِ زندگی نہیں

غم کے سرورِ خاص کا جس کو شعور ہی نہیں
عشق کے کاروبار میں اس کے لیے خوشی نہیں

سجدۂ شوق سے کبھی سر نہ اُٹھے تو بات ہے
سجدہ گاہ میں شوکتِ بندگی نہیں

تیری نگاہِ ناز کی چارہ گری کو کیا کہوں
درد میں کچھ کمی بھی ہے اور کوئی کمی نہیں

تو جو کہے تو موت بھی حاصلِ صد حیات ہے
میں جو کہوں تو زندگی موت ہے زندگی نہیں

سچ تو یہ ہے جہان میں حرفِ عبث ہے دوستی
نام کے آدمی تو ہیں کام کے آدمی نہیں

شوق کی بے خودی ہے یہ رُوح کی بے کلی ہے یہ
ماتمِ زندگی ہے یہ — نغمۂ زندگی نہیں

عامرِ نامراد کا — حالِ تباہ کیا کہوں
کشمکشِ حیات میں مہلتِ ہوش بھی نہیں
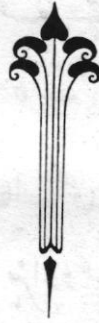
نہ تابِ نظّارہ میرے بس میں نہ ضبطِ غم میری دسترس میں
تری حکومت نظر نظر پر — ترا تصرّف نفس نفس میں

کسی کا دامن تو آچکا تھا ہمارے دستِ جنوں کے بس میں
بُرا ہو اس ہوش و آگہی کا اُلجھ گئی عقل پیش و پس میں

ہزار توڑوں رسوم و راہیں ہزار ضبطِ شوق کر لوں
مگر محبّت کا ربطِ باہم نہ تیرے بس میں نہ میرے بس میں

نصیب ہو لذّتِ حضوری تو زندگی مستقل عبادت
اگر میسّر نہیں حضوری عبادتیں بھی فضول رسمیں

اگر نہیں تجھ میں تیز گامی خطا ہے یہ اہلِ کارواں کی
دلوں کو جو محوِ رقص کر دے وہ لے نہیں سینۂ جرس میں

کوئی مری سادگی تو دیکھے میں اب بھی وعدوں پہ جی رہا ہوں
فضا میں تحلیل ہو چکے ہیں ہزار وعدے ہزار قسمیں

کبھی غمِ یک نفس بھی کافی، کبھی عبث گریۂ مسلسل
کسی کا انعام منحصر ہے نہ ایک دن میں نہ سو برس میں

درست صیّاد کا ستم بھی مگر حقیقت تو یہ ہے عامرؔ
جو ننگِ آدابِ گلستاں ہیں وہ لا کے رکھے گئے قفس میں

ان کی طلب میں خود بھی تڑپنا اور ہمیں تڑپانا بھی
کہنے کو یہ دل ہے اپنا، ہے لیکن بے گانا بھی

کفر نہ ایماں، دین نہ دنیا، یاس و تعطل خوف و ہراس
ایسے بے غیرت جینے سے بہتر ہے مر جانا بھی

نام کی مسجد نام کے مندر آج بھی لاکھوں ہیں لیکن
مدّت گزری ٹوٹ چکا ہے کعبہ بھی بُت خانہ بھی

اہلِ جہاں کے دل ہیں پتھر، پتھر میں نرمی مت ڈھونڈ
لاحاصل ہے ان بہروں کو — دل کی بات سنانا بھی

تیرے سوا دنیا میں دے گا ان زخموں کا مرہم کون
جن کو چھپانا بھی ناممکن — ناممکن دکھلانا بھی

ہائے وہ فرطِ یاس کا عالم ہائے وہ رنگِ شدتِ غم
جب ناممکن ہو جاتا ہے دو آنسو ٹپکانا بھی

میسّر جن کو غم میں کیفِ بے پایاں نہیں ہوتا
انھیں کچھ اور ہوتا ہے غمِ جاناں نہیں ہوتا

الٰہی خیر دل کی بے قراری آج کیوں کم ہے
سمندر کا سکوں — بے آمدِ طوفاں نہیں ہوتا

بھکاری رشک مت کر قہقہوں پر اہلِ دولت کے
کہ اکثر ہونٹ ہنس دیتے ہیں دل خنداں نہیں ہوتا

وہ جس کی زندگی ہی مستقل اک رات بن جائے
سحر پر ختم اس کا — قصّۂ ہجراں نہیں ہوتا

کوئی تیراک عام ڈوب جاتا ہے کنارے پر
کوئی گرداب میں رہ کر بھی — ترداماں نہیں ہوتا
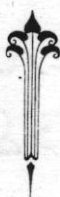
لوٹے کچھ اس طرح تری جلوہ سرا سے ہم
بنتے گئے قدم بہ قدم آئنہ سے ہم

اس درجہ پائمال نہ ہوتے جفا سے ہم
لوٹے گئے سیاستِ مہر و وفا سے ہم

باقی ہی کیا رہا ہے تجھے مانگنے کے بعد
بس اک دعا میں چھوٹ گئے ہر دعا سے ہم

دیکھی گئی نہ ہم سے ـــــ شکستِ غرورِ حُسن
شرما گئے ـــــ ارادۂ ترکِ وفا سے ہم

یہ کیا کہا ـــــ جنوں ہے محبّت کی انتہا
اے بے خبر چلے ہیں اسی انتہا سے ہم

مانا کہ دل کو تیرے نہ ملنے کا غم رہا
صد شکر بچ گئے ـــــ طلبِ ماسوا سے ہم

اے حسنِ بے کراں ترے ملنے کا ذکر کیا
آنکھیں لگا سکے نہ تری خاکِ پا سے ہم

کیا ربط ہے کہ فرقِ مراتب کے باوجود
بے آسرا سے آپ ہیں بے آسرا سے ہم

جس آستاں کو ہم سے ملیں لاکھ عظمتیں
واحسرتا! اسی پہ کھڑے ہیں گدا سے ہم

ڈالی تھی اس نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ
برسوں رہے خود اپنے لیے لاپتا سے ہم

رحمت کے لعل و لب پہ پسینہ سا آگیا
گردابِ معصیت سے ہٹے تھے ذرا سے ہم

غمِ بے حد میں کس کو ضبط کا مقدور رہتا ہے
چھلک جاتا ہے پیمانہ اگر بھرپور رہتا ہے

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے ___ کہ دل رنجور رہتا ہے
مگر انسان ہنسنے کے لیے ___ مجبور رہتا ہے

فضائے زندگی کی ظلمتوں کے مرثیہ خوانو!
اندھیروں ہی کے دم سے امتیازِ نور رہتا ہے

نہیں یہ مرحلہ اے دوست ہر بسمل کی قسمت میں
بہت مشکل سے کوئی زخمِ دل ناسور رہتا ہے

بہ سعیِ ضبطِ غم آنکھوں میں آنسو روکنے والے
سفینوں میں کہیں طوفان بھی مستور رہتا ہے

یہ قدم قدم اسیری ــــ یہ حسین قید خانہ
کوئی طوق ہے نہ بیڑی کوئی دام ہے نہ دانہ

کوئی ہو سمجھنے والا ــ تو بہت نہیں فسانہ
کبھی مُسکرا کے رونا کبھی رو کے مُسکرانہ

یہ عبادتیں مرصّع ــــ یہ سجودِ مجُرمانہ
مجھے ڈر ہے بن نہ جائیں مرے کفر کا بہانہ

مرے زخم بھر نہ جائیں مجھے چین آ نہ جائے
یہ کبھی کبھی توجّہ ہے ستم کا ــــ شاخسانہ

یہ سمجھ کے اس نے بخشی کبھی دولتِ سکوں بھی
کہیں راس آ نہ جائے مجھے گردشِ زمانہ

وہ کبھی جہاں پہ عامرؔ مجھے چھوڑ کر گئے تھے
ہے رُکی ہوئی ابھی تک وہیں گردشِ زمانہ

وصال و دیدار کی خوشی کیا اگر تمھاری رضا نہیں ہے
خدا تمھاری رضا کو رکھّے، فراق بھی بے مزا نہیں ہے

زبان و دل محوِ کشمکش ہیں، کسی میں بھی حوصلہ نہیں ہے
دعا شریکِ زباں نہیں ہے، زباں شریکِ دُعا نہیں ہے

تری وفا کا مآل کیا ہو، یہ سوچنا بھی روا نہیں ہے
وفا کے بندے وفا کیے جا، وفا کا کوئی صلہ نہیں ہے

مری خطاؤں کا عذر سُن کر، ترس تمھیں بھی ضرور آئے
مگر جسے تم خطا سمجھ لو، یہ کیسے کہہ دُوں خطا نہیں ہے

خوشا وہ جلوہ کہ ذرّہ ذرّہ میں رُوح بن کر سما گیا ہے
زہے یہ محویّتِ محبّت، کہ ماسوا ماسوا نہیں ہے

مآل سے بے نیاز ہو کر کچھ اس طرح محوِ بندگی ہوں
کہ راحتوں کی خوشی ہے لیکن، مصیبتوں کا گِلہ نہیں ہے

بجا کہ نا حق شناسیوں میں، گزار دی ہم نے عمر ساری
مگر ہماری سیاہ کاری، ترے کرم سے سوا نہیں ہے

ہزار عنواں بدل بدل کر فسانۂ عشق کہہ چکا ہوں
مگر یہ محسوس ہو رہا ہے، کہ جیسے کچھ بھی کہا نہیں ہے

نفس نفس جن کی آرزو تھی، قدم قدم جن کی جستجو تھی
وہ اب نگاہوں کے سامنے ہیں، تو کچھ ہمارا پتا نہیں ہے

غمِ مسلسل کی تلخیوں نے، بدل دیا ہے مزاج دل کا
اُمنگ ہے آرزو نہیں ہے، تلاش ہے مدّعا نہیں ہے

وہ ایک شاعر غموں کا مارا، وہی تمھارا غریب عاؔمر
ہزار مصروفیت ہو لیکن، کبھی تمھیں بھولتا نہیں ہے

خوشا — نادانیِ اربابِ دانا
قفس کو کہہ رہے ہیں آشیانہ

تمنّا — اور اتنی احمقانہ
مرا سر اور ان کا آستانہ

حریفِ صد فتوحاتِ زمانہ
محبّت کی شکستِ فاتحانہ

محبّت آپ ہی — اپنی حقیقت
محبّت آپ ہی اپنا فسانہ

کبھی دن کا اُجالا بھی فسردہ
کبھی شب کا اندھیرا بھی سُہانا

جہاں طائر ہوں خود ہی پر شکستہ
وہاں کیا احتیاجِ دام و دانہ

چمن میں جی رہا ہوں مثلِ شبنم
مری تقدیر ہے آنسو بہانا

کوئی اے کاش غنچوں کو بتاتا
بہت مہنگا پڑے گا مُسکرانا

محبّت خود ہی خرمن خود ہی بجلی
ہے اس کی زندگی جلنا جلانا

محبّت کو خطا ٹھہرانے والو!
محبّت ہے گناہِ عارفانہ

گزارے ہیں کچھ ایسے دن بھی عامؔر
بلا کیفِ حضوری غائبانہ

تھی سیاہیوں کا مسکن مری زندگی کی وادی
ترے حسن کے تصدّق مجھے روشنی دکھا دی

ترا غم سما گیا ہے مرے دل کی دھڑکنوں میں
کوئی عیش جب بھی آیا مرے دل نے بددعا دی

جو ذرا بھی نیند آئی کبھی اہلِ کارواں کو
وہی بن گئے لٹیرے جو بنے ہوئے تھے ہادی

وہ کبھی نہ بن سکی ہے، وہ کبھی نہ بن سکے گی
کسی دل کی جو عمارت تری بے رخی نے ڈھا دی

یہ کبھی کبھی عنایت ــــ ہے بمنزلِ سیاست
کہ جفائیں سہنے والا کہیں ہو نہ جائے عادی

ہمیں آخر میں عامرؔ وہی عمر کام آئی
جسے کہہ رہی تھی دنیا غمِ عشق میں گنوا دی

بہت چراغ نئے فکر نے جلائے ہیں
مگر خلوص و وفا کے دیے بجھائے ہیں

ہجومِ شوق میں ایسے بھی وقت آئے ہیں
ہم اپنے اشک بہانے پہ مسکرائے ہیں

بجا ہے تلخیِ فریاد کا ــــــ گلہ ناصح!
مگر وہ زخم بھی دیکھے! جو ہم نے کھائے ہیں

نشاطِ عشق کی ــــــ محویّتوں میں گم ہو کر
خزاں میں ہم نے محبّت کے گیت گائے ہیں

نہ پوچھ راہِ محبّت کی ٹھوکروں کے مزے
کہ ہم نے سوچ سمجھ کر فریب کھائے ہیں

طلب کی راہ میں یہ کیا مقام ہے عامؔر
تھکے نہیں ہیں مگر پاؤں ڈگمگائے ہیں
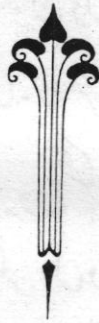
جس نے بُتوں سے حکمِ بغاوت دیا نہیں
ہوگا خدا کسی کا، وہ میرا خدا نہیں

میں کیا کہوں کہ عشق کی قدرت میں کیا نہیں
لیکن سروں میں آج یہ سودا رہا نہیں

ہم ہی وفا کے عہد پہ قائم نہ رہ سکے
اپنے سوا ہمیں تو کسی کا گِلہ نہیں

صدیاں ہوئیں کہ آئی تھی گلشن میں فصلِ گُل
لیکن دلوں سے اُس کا تصوّر گیا نہیں

انساں کو جو سکونِ دل و جاں نہ دے سکے
وہ ارتقاء کسی بھی مرض کی دوا نہیں

لذّت فروشِ روح شکن عصرِ نو کے پاس
سب کچھ تو ہے مگر دلِ درد آشنا نہیں

جس کے جِلو میں جہد و عمل کی تڑپ نہ ہو
وہ صرف اک فریبِ دعا ہے دعا نہیں

منبر سے لے کے مدرسہ و خانقاہ تک
عام کہاں ——— ہجومِ نمود و ریا نہیں

ہزاروں طاق سجے سیکڑوں چراغ جلے
ہماری رات کے سائے مگر ذرا نہ ڈھلے

مآلِ جذب و جنوں جو بھی ہو خدا کے سپرد
وفورِ شوق میں تیغوں پہ رکھ دیے ہیں گلے

تمام عُمر گزاری ہوس کے سائے میں
اَجل کا وقت جو آیا تو ہم نے ہاتھ مَلے

بتوں کے در سے عطا ہو جو عزّت و حشمت
ہم ایسی عزّت و حشمت سے دُور دُور بھلے

بلا سے لاشۂ اسلام بے کفن ہی سہی
لحد پہ عرس ہو چادر چڑھے چراغ جلے

حرم کے حق میں ہیں وہ مارِ آستیں عامر
دل و دماغ جو بچپن سے میکدے میں پلے
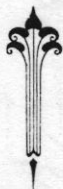
یارب! کتنے دیوانے ہیں آج کی دُنیا کے فرزانے
اس کو مسیحا مان رہے ہیں درد بڑھایا جس کی دوا نے

نیند کے سائے میں جو گزرے صرف وہی لمحے تھے سُہانے
تعبیروں نے توڑ دیے ہیں خوابوں کے سب تانے بانے

کتنے فنکاروں نے سجائے جسمِ ہوس میں عشق کے چہرے
دیوانوں کا بھیس بدل کر پھرتے ہیں کتنے فرزانے

میخواروں میں شاید کوئی اتنا سادہ لوح نہ ہو گا
میں نے پہلی ہی توبہ میں توڑ دیے سارے پیمانے

شہروں کی رونق کے پیچھے ایک بھیانک سنّاٹا ہے
بستی بستی پھیل گئے ہیں حسرت و حرماں کے ویرانے

یہ جو کوئی سودائی عام آج درِ جاناں پہ پڑے ہیں
مدّت گزری واعظ بن کر آئے تھے مجھ کو سمجھانے

تجھے تو کیا ترے جلووں کی ضو بھی پا نہ سکے
جو زندگی کو تری راہ میں لٹا نہ سکے

حیاتِ شوق بھی اک سجدۂ مسلسل ہے
سرِ نیاز جھکایا تو پھر اٹھا نہ سکے

زہے نصیبِ محبّت سما گئے دل میں
وہی جو وسعتِ افلاک میں سما نہ سکے

جو دے رہی ہے ہمیں جام بے طلب دنیا
طلب کریں تو یہی زہر بھی پلا نہ سکے

مجھے بتاؤ کہاں ہے وہ شہرِ عشق جہاں
ہوس لباسِ تمنا میں سر اُٹھا نہ سکے

مری نظر میں وہی سر ہے سر جسے عامر
زمانہ کاٹ تو ڈالے مگر جھکا نہ سکے

عشق محرومِ زباں ہو کے زباں ہوتا ہے
ہونٹ ہلتے نہیں افسانہ بیاں ہوتا ہے

علم جب مائلِ تخریب جہاں ہوتا ہے
عشق آمادۂ شمشیر و سناں ہوتا ہے

جتنی جتنی ستمِ یار سے کھاتا ہے شکست
دل جواں اور جواں اور جواں ہوتا ہے

واہ کیا چیز ہے یہ شدّتِ ربطِ باہم
بارہا خود پہ مجھے تیرا گماں ہوتا ہے

کتنی پامال اُمنگوں کا ہے مدفن مت پوچھ!
وہ تبسم جو حقیقت میں فغاں ہوتا ہے

غم کی بڑھتی ہوئی یورش سے نہ گھبرا اے آمرؔ
غم بھی اک منزلِ راحت کا نشاں ہوتا ہے
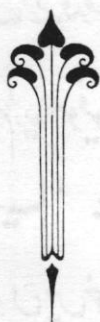
خرد کی پستیاں کہاں جنوں کی رفعتیں کہاں
جنوں ہے مستقل یقیں خرد ہے سربسر گماں

حجابِ درمیاں اٹھا تو عصمتِ نظر کہاں
نظر کی کائنات ہے یہی حجابِ درمیاں

کتابِ کُفر در بغل خدا کا نام برزباں
یہ زہد ہے تو اَلحَذَر یہ دین ہے تو الاَماں

پری وشوں سے چاہ تھی بتوں سے رسم و راہ تھی
خدا کا نام لے لیا بطورِ زیبِ داستاں

پرستشوں کے پھیر سے مرے خدا مجھے بچا
بنے ہوئے ہیں شرک کے قدم قدم پہ آستاں

یہ خانقاہ کے حرم، یہ صوفیوں کے آشرم
جہادِ زندگی ہے کیا، یہ تذکرہ نہ کر یہاں

بہت ستم زدہ ہوں میں خود اپنے برگ و بار سے
حقیقتاً حریف ہیں نہ بجلیاں نہ آندھیاں

میں جانتا تھا دار سے قریب وادیٔ وفا
اسی ڈگر پہ لے چلا جنوں مجھے کشاں کشاں

خیالِ سود و زیاں مٹا دے گزر غمِ خیر و شر سے پہلے
یہی تو دشوار منزلیں ہیں مقامِ سوزِ جگر سے پہلے

سحر کے انوار دیکھتا ہوں طلوعِ نجمِ سحر سے پہلے
نظر میں یہ وسعتیں کہاں تھیں کسی کے فیضِ نظر سے پہلے

تجھے خود اپنی خبر ہے لازم جہاں کے علم و خبر سے پہلے
مسافتِ قلب و روح طے کر سیاحتِ بحر و بر سے پہلے

یہ کیسی منزل ہے کیسی راہیں کہ تھک گئے پاؤں چلتے چلتے
مگر وہی فاصلہ ہے قائم جو فاصلہ تھا سفر سے پہلے

قفس کے اے سادہ دل اسیرو قفس کا در توڑنا تو ممکن
مگر چمن تک بھی جا سکو گے یہ پوچھ لو بال و پر سے پہلے

خرد کے بَل پر جو دے رہے ہیں ہماری دیوانگی کو طعنے
وہ اہلِ ظاہر گزر کے دیکھیں ذرا تری رہگزر سے پہلے

خلوصِ شوقِ طلب سے پہلے کہیں بھی پائے طلب نہ ٹھہرا
ہزار دیر و حرم نے روکا ہمیں ترے سنگِ در سے پہلے

میں وضعداری میں مہر برلب زباں پہ انکی حیا کے پہرے
یہ دیکھنا ہے کہ آخر آخر دھواں اٹھے گا کدھر سے پہلے

طویل و مایوس زندگی میں یہ رات کیسے کٹے گی یارب!
چراغِ امید گل ہوا ہے ظہورِ نورِ سحر سے پہلے

نوازشِ چارہ گر نے ہمدم دیا تو دل کو قرار لیکن
دل اس قدر مضمحل نہیں تھا نوازشِ چارہ گر سے پہلے

کہاں نظر کا وہ اک تصادم کہاں یہ مضبوط ربطِ باہم
ضرور ان سے یہ فتنہ گر دل ملا ہوا تھا نظر سے پہلے

درِ حوادث پہ سر جھکانا مری خودی کو نہیں گوارا
میں آشیاں خود ہی پھونک لوں گا نزولِ برق و شرر سے پہلے

کمالِ علم و ہنر نے عام بنا دیا رات کو سویرا
گناہ اتنا حسین کب تھا کمالِ علم و ہنر سے پہلے

مجاہدو! اس کو یاد رکھنا یہ ایک نکتہ ہے عارفانہ
جہادِ حق کارگر نہ ہوگا ___ اگر نہیں گریۂ شبانہ

ہزار جدّت طرازیوں کے لباس بدلا کرے زمانہ
مگر یقیناً رہے گا قائم ___ مزاجِ باطل وہی پرانا

عروج سے بہرہ ور نہ ہوگی کبھی حیاتِ منافقانہ
زباں پہ اسلام کا وظیفہ مگر خیالات کافرانہ

ہماری غفلت کی انتہا کیا، ہماری پستی کا کیا ٹھکانہ
گناہ تو پھر گناہ ٹھہرا عبادتیں بھی ہیں مجرمانہ

نوائے حق کو اگر یہ دنیا قرار دیتی ہے باغیانہ
میں تہمتِ بزدلی نہ لوں گا مجھے گوارا ہے سر کٹانا

مجھے خبر ہے میں جانتا ہوں یہ دَور ہے آگ کا سمندر
مگر غمِ عشق کا سفینہ اسی کی موجوں پہ ہے چلانا

بلا سے کروٹ نہ لیں اندھیرے بلا سے پروا کرے نہ آندھی
مگر مرا فرضِ منصبی ہے چراغ پیہم جلائے جانا

وہ دورِ نقصان و ابتلا ہو کہ عہدِ اقبال و کامرانی
وفا کے بندے رضا کے پیکر گزار دیں گے مجاہدانہ

وہ کوئی درگاہ ہو کہ مسجد اگر وہاں از رہِ عبادت
نیاز مندی ہو ما سوا کی تو اس سے بہتر شراب خانہ

قدم قدم پر طرح طرح کی عبادتیں وضع کرنے والو!
بتاؤ کیا تم نے دینِ حق کو حقیر اور ناتمام جانا

ستیزہ گاہِ عمل سے عاری جو کُنجِ عُزلت میں لا بٹھائے
وہ زہد ہے یاس و بزدلی کو جواز دینے کا اک بہانہ

اگرچہ لذّتِ کام و دہن فراہم ہے
مگر دلوں پہ بڑی بے کسی کا عالم ہے

نہ پاسِ مہر و وفا ہے نہ ربطِ باہم ہے
نجوم طعنہ بلب ہیں یہ ابنِ آدم ہے

نہ خم ہوا تھا کسی در پہ جو خدا کے سوا
وہ سر خدا کے سوا آج ہر جگہ خم ہے

بہت ہے عشق کو اک التفاتِ درپردہ
مگر ہوس کو نشاطِ دوام بھی کم ہے

زباں پہ عیش کے نغمے دلوں میں شورشِ غم
یہ زندگی تو نہیں ـــــ زندگی کا ماتم ہے

میں چل پڑا ہوں اُسی منزلِ حسیں کی طرف
کہ جس کی راہ میں کرب و بلا مسلّم ہے

نہ اضطراب، نہ دردو خلش، نہ سوزو گداز
دلِ خراب ہمیں تیری موت کا غم ہے

یہ کس مقام پہ لایا ہے مجھ کو دل کہ جہاں
ہر ایک تازہ جراحت کا نام مرہم ہے

سکونِ منزلِ مقصود کے تمنّائی!
یہ ہم سے پوچھ محبّت جہادِ پیہم ہے

ہوا ہے جوششِ عمل اور بھی فزوں عاؔمر
خدا کا شکر کہ ہم سے زمانہ برہم ہے
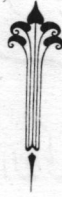
راہِ وفا میں کام نہ آیا جاں بازی کا دعویٰ تنہا
بے مصرف لا حاصل نکلا لفظوں کا سرمایہ تنہا

ہم نے ماضی کی تصویریں آنکھوں کے پردوں میں ڈھونڈیں
آئینے کو آگے رکھ کر —— اکثر جی بہلایا تنہا

اب یہ دنیا شوق سے مجھ پر پتھّر پھینکے تیر چلائے
میں تو خود میں گوشہ نشیں ہوں پھرتا ہے اک سایہ تنہا

ہنگاموں کی اس دنیا میں تنہائی نایاب ہے لیکن
جب بھی کوئی وقت پڑا ہے ہم نے خود کو پایا تنہا

مشقِ ستم فرمانے والے کاش کبھی اتنا بھی سوچیں
ضبط کا ساغر جب چھلکے گا کیا میں ہوں گا رسوا تنہا

جب تک چھلکے بادۂ عشرت جام کے حصّہ دار ہزاروں
لیکن پینی ہی پڑتی ہے غم کی صہبا تنہا تنہا

آخر آخر ہوش و خرد بھی ان کی نظر کے گھائل نکلے
پہلے پہلے ہم سمجھے تھے دل ہی اُن پر آیا تنہا

یارو تم نے بستی بستی انسانوں کی بھیڑ تو دیکھی
دیکھ سکو تو یہ بھی دیکھو ہر انساں ہے کتنا تنہا

کیسے کیسے طعن سنے ہیں کم ظرفی کے بے صبری کے
لرزاں تھا میری پلکوں پر پانی کا اک قطرہ تنہا

کس کا سورج کیسے تارے کافی ہے اربابِ نظر کو
دریا کی اک بوند اکیلی صحرا کا اک ذرّہ تنہا

دل نے کتنے شوق سے عامرؔ یہ سودا منظور کیا ہے
ساری عمرِ وفا کی قیمت ان کا بس اک جلوہ تنہا

ماتھے پر تحریر ہے غم کی، خشک ہیں لب آنکھیں نم ہیں
ہم سے ہمارا حال نہ پوچھو ہم تو سراپا ماتم ہیں

روحیں بیکل، ذہن پریشاں، سینے کربِ مجسّم ہیں
اور بظاہر اس دُنیا کو کیا کیا عیش فراہم ہیں

ٹیسوں میں اک لذّت پنہاں، کرب و خلش میں کیف نہاں
عشق نے جو بھی زخم دیے ہیں آپ ہی اپنا مرہم ہیں

وہم و گماں کے شیش محل ہیں ریت کے تودوں پر قائم
اور یقیں کے تاج محل کی ــــــ بنیادیں مستحکم ہیں

اس سے بڑھ کر دورِ ترقی عہدِ سعادت کیا ہوگا
آج لٹیروں کے ہاتھوں میں اُونچے اُونچے پرچم ہیں

آج کے دورِ علم و ہنر میں مہر و وفا کا نام نہ لے
آج پرانے وقت کی ساری قدریں درہم برہم ہیں

فکر و نظر کیا، قلب و جگر کیا سب ہیں اسیرِ زلفِ بُتاں
سچ تو یہ ہے صحنِ حرم میں صرف ہمارے سر خم ہیں

جو محرومِ ذوقِ طلب ہیں جن کے دل بیدار نہیں
ان کے لیے ساری تفصیلیں ساری شرحیں مبہم ہیں

کل تک جن کی تشنہ لبی کو دریا بھی ـــ ناکافی تھے
آج وہی اربابِ عزیمت شکر گزارِ شبنم ہیں

گل چینوں کا شکوہ بے جا، صیّادوں کا ذکر فضول
میرے چمن کے مالی عام ـــ صیدِ نفاقِ باہم ہیں

حقیر خاک کے ذرّے تھے آسمان ہوئے
وہ لوگ جو درِ جاناں کے پاسبان ہوئے

شدہ شدہ وہی گلشن کے حکمران ہوئے
جو خارِ پا کے گلوں کا لہو — جوان ہوئے

ہم ایسے اہلِ جنوں پر ہنسے نہ کیوں دنیا
کہ سر کٹا کے سمجھتے ہیں کامران ہوئے

یہ کم نہیں کہ بجھائی ہے پیاس کانٹوں کی
بلا سے راہِ وفا میں لہولہان ہوئے

گلوں نے آبلہ پائی کی کوئی داد نہ دی
چمن میں خار ہی چھالوں کے میزبان ہوئے

کیا جو بھول کے دل نے خیالِ ترکِ وفا
ہم اپنے آپ سے کیا کیا نہ بدگمان ہوئے

لحد میں سیکڑوں اسکندر و جم دیکھے ہیں
سب کے سر موت کے دروازے پہ خم دیکھے ہیں

صرف اک تیرے تغافل کا گلہ ہی تو نہیں
ہم نے دنیا کے بہت اور ستم دیکھے ہیں

کیا سمائے گی نگاہوں میں یہ تاروں بھری رات
ہم نے اے دوست ترے دیدۂ نم دیکھے ہیں

وہی صہبائے تمنّا وہی صہبائے ہوس
سیکڑوں اہلِ محبّت کے بھرم دیکھے ہیں

عصرِ حاضر کی ہوسناک تقاضوں کی نہ پوچھ!
اہلِ دل —— شیفتۂ دام و درم دیکھے ہیں

کیا سُناؤں میں تمھیں عامرِ دیوانے کی بات
ایسے سُلجھے ہوئے دیوانے بھی کم دیکھے ہیں
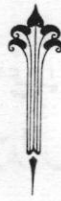
یہ سیل، بے رنگ آنسوؤں کا فضول ہے لاکھ بار آئے
بنے گا موتی وہ اشکِ رنگیں لہو سے جو ہمکنار آئے

چمن کے دیدہ وروں کو یارو، ہنسی نہ کیوں بار بار آئے
میں فصلِ گلُ اس کو کہہ رہا ہوں خزاں کو بھی جس سے عار آئے

وفا تو کانٹوں کی سرزمیں ہے یہاں وہی جاں نثار آئے
سکون میں جس کو بے کلی ہو تڑپ میں جس کو قرار آئے

چمن کے وہ خود پرست مالی جنھیں خزاں راس آگئی ہے
وہ کس لیے آرزو کریں گے چمن میں فصلِ بہار آئے

متاعِ گلشن کچھ ایسی بانٹی مرے وفادار دوستوں نے
نہ میرے دامن میں پھول پہنچے نہ اُنکے دامن میں خار آئے

درِ گلستاں پہ فصلِ گل کے ــــــ حسین کتبے لگانے والو!
ہمیں تو درکار ہے وہ موسم گلوں کو جو سازگار آئے

یہ کوئے جاناں ہے ہم صفیرو! عزیز ہو سر تو لوٹ جاؤ
ابھی تو آیا ہے صرف زنداں ابھی توقع ہے دار آئے

وفا کے ایوانِ مرمریں پر جلی قلم سے لکھا ہوا ہے
یہاں وہی سرفراز ہوگا جو سر کی بازی بھی ہار آئے

خیالِ جاناں کی محویت میں کچھ ایسی چوٹیں بھی سہہ گیا ہوں
سُنوں اگر اور کی زباں سے نہ خود مجھے اعتبار آئے

ہے رائیگاں دوستو وہ ساعت رہے جو محرومِ جذبِ مستی
وہ سانس قیمت میں کچھ نہیں ہے نہ جس سے پیغامِ یار آئے

بہت ہی چھوٹی سی داستاں ہے ہماری صحرا نوردیوں کی
وہاں وہاں ہم برہنہ پا تھے جہاں جہاں خارزار آئے

یہ خوش نصیبی نہیں تو کیا ہے کہ اپنی مٹی لگی ٹھکانے
وہ سر جو تھا بارِ دوشِ عالم کسی کے قدموں پہ وار آئے
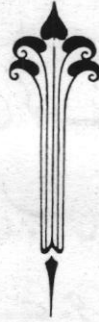
کاش اپنی یہ حالت گوشِ یار تک پہنچے
ضبط سے گزر کر ہم اضطرار تک پہنچے

کتنے رہزن و قاتل اقتدار تک پہنچے
کتنے بے خطا ملزم طوق و دار تک پہنچے

سرد ہو تو سکتی ہے اب بھی آتشِ نمرود
کوئی ابنِ ابراہیمؑ پہلے نار تک پہنچے

یہ جنوں بھی کیا شے ہے خود ہی تیرے دیوانے
عرشِ لالہ و گل سے فرشِ دار تک پہنچے

حشرِ دار و گیر اُٹھّا اب یہ آزمائش ہے
کون سر بکف غازی کوئے یار تک پہنچے

لذّتِ سکونِ دل بس اسی کو ہے معلوم
راہِ بے قراری سے جو قرار تک پہنچے

دیکھنا کہ اک دن وہ کارواں بھی پالیں گے
جستجو کے دیوانے جو غبار تک پہنچے

پردۂ حریمِ ناز ــــ دور ہی سہی عامرؔ
یہ نصیب کیا کم ہے کوئے یار تک پہنچے
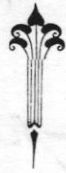
خشک ہے پیاس کی شدّت سے زباں اے ساقی
بے کسی ہے تری جانب نگراں اے ساقی

اب نہ فریاد نہ ماتم نہ فغاں اے ساقی
نطق و گویائی کی طاقت ہی کہاں اے ساقی

ایک ملّاح سے محروم سفینے کی طرح
زیست ہے بحرِ حوادث میں رواں اے ساقی

جن کا ہر سانس تھا اک موجۂ صہبائے نشاط
ان کے ہر سانس سے اٹھتا ہے دھواں اے ساقی

یاس کی گود میں خاموش ہے غوغائے حیات
بجھ گیا ——— شعلۂ اظہارِ بیاں اے ساقی

ان کی تقدیر میں اب جامِ سفالیں بھی نہیں
کھیل تھے جن کے لیے رطلِ گراں اے ساقی

یہ غم و فکر سے ڈھلکے ہوئے ویراں چہرے
جیسے اجڑی ہوئی قبروں کے نشاں اے ساقی

یہ لرزتے ہوئے ڈھانچے یہ سسکتے ہوئے دل
یہ تڑپتی ہوئی لاشوں کا سماں اے ساقی

گرمیٔ شوق سے خالی یہ جواں مرگ شباب
سرد و ساکن یہ اُمنگوں کا جہاں اے ساقی

لذّتِ خواب سے محروم ــــ یہ گھائل نیندیں
ناوکِ غم سے یہ زخمی دل و جاں اے ساقی

بے کراں عرصۂ ہستی میں ــــ نہ دیکھی ہوگی
کسی گلشن نے کبھی ایسی خزاں اے ساقی

کچھ تو بتلا تجھے ــــ اسرارِ محبّت کی قسم
کیا نہ بدلے گا کبھی دورِ جہاں اے ساقی

حُسن کی بارگاہیں گلی در گلی لالۂ و گُل کے جلوے چمن در چمن
جنّتیں اس جہاں میں بہت ہیں مگر آپ کی انجمن آپ کی انجمن

وقت کی گردشوں کا بھروسا ہی کیا مطمئن ہو کے بیٹھیں نہ اہلِ چمن
ہم نے دیکھے ہیں ایسے بھی کچھ حادثے کھو گئے رہنما لُٹ گئے راہزن

چند فرضی لکیروں کو سجدے نہ کر چند خاکی حدوں کا پجاری نہ بن
آدمیّت ہے اک موجۂ بیکراں ساری دنیا ہے انسانیت کا وطن

کتنے شاہیں بسیرے کو ترسا کیے باغ پر چھا گئے کتنے زاغ و زغن
کتنے اہلِ وفا دار پر چڑھ گئے کتنے اہلِ ہوس بن گئے نورتن

یہ قدم قدم بلائیں

صرف شہرِ سیاست کا ماتم نہیں ہر نگر ہر ڈگر ایک سا حال ہے
کتنی قبروں پہ چڑھتی رہیں چادریں کتنے لاشے پڑے رہ گئے بے کفن

دیجیے ترکِ تقویٰ کا طعنہ مگر ... شیخ کا حُسنِ تاویل تو دیکھیے
جب قدم زُہد کے ڈگمگانے لگے رکھ دیا حُسن کا نام توبہ شکن

اِن چراغوں کی تھوڑی سی لَو کاٹ دو اُن چراغوں سے اُٹھنے لگا ہے دُھواں
غنچۂ و گُل کا دم گھُٹ نہ جائے کہیں رچ گئی ہے فضا بڑھ گئی ہے گھُٹن

بزم میں ایک جوئے رواں ہے جنوں عزم میں ایک برقِ تپاں ہے جنوں
یہ تماشا ہے عامِ جنوں تو نہیں مچ گئی ہاؤ ہو پھٹ گئے پیرہن
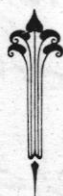
درد بڑھتا گیا جتنے درماں کیے پیاس بڑھتی گئی جتنے آنسو پیے
اور جب دامنِ ضبط چھٹنے لگا ہم نے خوابوں کے جھوٹے سہارے لیے

عشق بڑھتا رہا سوئے دار و رسن زخم کھاتا ہوا مسکراتا ہوا
راستہ روکتے روکتے تھک گئے زندگی کے بدلتے ہوئے زاویے

گم ہوئی جب اندھیروں میں راہِ وفا ہم نے شمعِ جنوں سے اجالا کیا
جب نہ پائی کوئی شکلِ بخیہ گری ہم نے کانٹوں سے زخموں کے منہ سی لیے

اس کے وعدوں سے اتنا تو ثابت ہوا اس کو تھوڑا سا پاسِ تعلق تو ہے
یہ الگ بات ہے وہ ہے وعدہ شکن یہ بھی کچھ کم نہیں اس نے وعدے کیے

ختم ہونے کو ہے قصۂ زندگی اب ہمیں آپ سے کوئی شکوہ نہیں
ٹل نہ جائے کہیں موت آئی ہوئی پرسشِ غم کی زحمت نہ فرمائیے

یہ قدم قدم بلائیں

جب حجابوں میں پنہاں تھا حسنِ بتاں بُت پرستی کا بھی ایک معیار تھا
اب تو ہر موڑ پر بُت ہی بُت جلوہ گر اب کہاں تک بتوں کو خدا مانیے

کتنے اربابِ ہمّت نے ان کے لیے بڑھ کے میدان میں جان بھی ہار دی
اب بھی اُن کی نگاہوں میں ہے بدظنی اب بھی اُن کو وفا کی سَند چاہیے

جس نے لوٹا تھا اس کو سلامی مِلی ہم لُٹے، ہم کو ملزم بتایا گیا
مست آنکھوں پہ الزام آیا نہیں ہم پہ لگتی رہیں تہمتیں بِن پیے

جس نے عامِ متاعِ خودی بیچ دی سچ یہ ہے عصمتِ زندگی بیچ دی
سر جھکانے سے بہتر ہے سر دیجیے بھیک لینے سے بہتر ہے مر جائیے

اب تو وہ جو بھی سزا دے وہ روا ہے یارو
میں نے صیّاد کو صیّاد کہا ہے یارو

اف یہ نیرنگیٔ تقدیر بھی کیا ہے یارو
آکے ساحل پہ کوئی — ڈوب رہا ہے یارو

کتنا معصوم یہ اندازِ جفا ہے یارو
کوئی مجھ سے ہی مجھے — پوچھ رہا ہے یارو

دل کسی بُت کو نہ دیں گے نہ دیا ہے یارو
ایک لے دے کے یہی قبلہ نما ہے یارو

میری آواز میں کیا خاک دھرا ہے یارو
یہ تو پردے سے کوئی بول رہا ہے یارو

آج تسبیح و مصلّٰی سے — بھلا کیا ہوگا
کوچۂ یار تو سر مانگ رہا ہے یارو

رِس رہا ہے مرے اشعار سے قطرہ قطرہ
زخم جو بھی مجھے دُنیا نے دیا ہے یارو

آئنہ تک مری صورت کا شناسا نہ رہا
وقت نے مجھ سے مجھے چھین لیا ہے یارو

اب نہ پوچھو دلِ مایوس وفا کا عالم
دُور ہٹتے ہوئے قدموں کی صدا ہے یارو

شوق سے قتل ہوئے دھار پہ گردن رکھدی
اہلِ دل کا یہی ــــــ معیارِ وفا ہے یارو

غالباً یاس کی معراج پہ آپہنچا ہوں
نہ طلب ہے نہ توقّع ــــــ نہ گلہ ہے یارو

ظاہراً توڑ لیا ہم نے بتوں سے رشتہ
پھر بھی سینے میں صنم خانہ بسا ہے یارو

آج کیا چل ہی بسا بزمِ جہاں سے عاؔمر
کم سوادوں میں یہ کیوں جشن بپا ہے یارو

اہلِ ہوس کیا ساتھ نبھاتے سخت کٹھن تھی منزل منزل
عشق تو آخر عشق ہی ٹھیرا، راہیں ڈھونڈیں مشکل مشکل

جب بھی وہ نزدیک ہوئے ہیں دل کا ایسا حال ہوا ہے
جیسے نیّا ڈگ مگ ڈگ مگ جیسے دیپک جھلمل جھلمل

دولت کی پوجا کو دُنیا زیست کا حاصل ٹھہراتی ہے
لیکن میں سو بار کہوں گا ——— "زہرِ ہلاہِل زہرِ ہلاہِل"

ہانپ رہے ہیں میرے ساتھی اور ابھی آغازِ سفر ہے
شور بپا ہے اُف یہ مراحِل اُف یہ مراحل

تم سے چھُٹ کر سب کچھ پایا ——— لیکن دل کا چین نہ پایا
دیکھ پھرے ہم جادہ جادہ ڈھونڈ پھرے ہم منزل منزل

کتنے ہی احباب کا ہم نے معیارِ اخلاص یہ دیکھا
دل بےگانوں سے وابستہ تن اپنوں میں شامل شامل

فتح وظفر یا غلبہ وکثرت ——— کوئی نہیں معیارِ صداقت
ہر حالت میں ہر صورت میں حق ہے حق اور باطل باطل

میری تازہ لاش پہ عالم دُنیا نے جب شور مچایا
وہ اک سمت اشارہ کر کے خود بھی چیخے قاتل قاتل
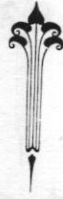
تجلیوں میں حواس گم ہیں، تمیزِ عشق و الم نہیں ہے
ستم کا شکوہ تو کیا کریں گے مجالِ شکرِ کرم نہیں ہے

جسے پذیرائی ستم ہیں، خوشی کا پہلو بہم نہیں ہے
وہ دل حقیقت میں دل نہیں ہے، وہ غم حقیقت میں غم نہیں ہے

ہمیں توسیلِ جنوں کی رَو میں وہیں سے مشکل ہوا گزرنا
طلب کے پُرپیچ راستوں میں جہاں کہیں پیچ و خم نہیں ہے

متانتِ ضبطِ اہلِ غم کو، سکوں پہ محمول کرنے والے
اسی میں سوئے ہوئے ہیں طوفاں جو آنکھ ظاہر میں نم نہیں ہے

جنوں کی شدّت میں اہلِ دل کو وفا کی توفیق کیا ملے گی
اگر محبّت کی سربلندی دماغ پر مرتسم نہیں ہے

مری جبینِ سخن پہ عام، عیاں ہے میرا ہی عکسِ باطن
مرے تخیّل میں کارفرما، عوام کا مدح و ذم نہیں ہے
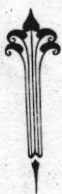
یہ چشمِ بے مروّت یہ جبینِ پُر شکن ساقی
یہی ہے کیا جوابِ اعتماد و حُسنِ ظن ساقی

کہا کرتے تھے جن فتنوں پہ خاکم در دہن ساقی
وہ فتنے بن گئے ہیں — زندگی کا پیرہن ساقی

ترے خوانِ کرم کے ریزہ چیں کتنی صفائی سے
مجھے میرے وطن میں کہہ رہے ہیں بے وطن ساقی

یہ ہم جیسے تہی دستوں کی قبریں کھودنے والے
اگر بس چل گیا سی دیں گے تیرا بھی کفن ساقی

جنھیں پی کر بہکنے کے سوا کچھ بھی نہیں آتا
وہ بادہ خوار بن بیٹھے ہیں تیرے نورتن ساقی

نہ اتنا مطمئن ہو بخششِ دستِ تغیّر سے
الٹ سکتی ہے پھر بھی یہ بساطِ انجمن ساقی
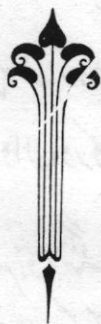
سکت ہو یا نہ ہو ہر حال میں کی ہے فغاں میں نے
نہیں ہونے دیا ان کے ستم کو رائیگاں میں نے

اجل کو دے دیا رنگِ حیاتِ جاوداں میں نے
خدا کا شکر دے دی آج ان قدموں پہ جاں میں نے

شبِ آخر سُنی یہ کس کی آوازِ فغاں میں نے
قمر تھرّا اٹھا تاروں کو دیکھا نیم جاں میں نے

تمھیں تو موت بھی دینے میں اس درجہ تامُّل ہے
کہ جیسے مانگ لی ہو دولتِ کون و مکاں میں نے

بتا اے ہم نفس تجھ سے کہوں رُوداد کس کس کی
لٹائی ہیں امیدیں کارواں در کارواں میں نے

یہ قسمت ہے کہ میرا سر ہی ننگِ آستاں ٹھیرا
بنایا تھا اسی سے آستاں کو آستاں میں نے

مری بربادیوں پر رونے والے کیا خبر تجھ کو
خریدی ہیں بہت کچھ دے کے یہ بربادیاں میں نے

قیامت ہے نہیں اس غم پہ بھی قابو مجھے عامؔر
دیا ہے جس کی قیمت میں نشاطِ دو جہاں میں نے
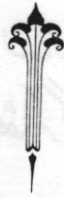
عشق و وفا کی راہ گزر میں زیرِ قدم جب کانٹے آئے
کتنے ہی اربابِ عزیمت ساتھ مرا دیکر پچھتائے

جشنِ چراغاں کرنے والو تم نے یہ کیسے دیپ جلائے
اور گھٹے کمتاب اُجالے اور بڑھے ظلمات کے سائے

رنج میسّر ہو یا راحت فتح ملے یا سر کٹ جائے
لیکن یا رب شوقِ طلب پر غفلت کا الزام نہ آئے

خوب ہے اے اربابِ محبّت ذکرِ بیانِ عظمتِ رفتہ
لیکن غازی وہ ٹھہرے گا جو ماضی کو حال بنائے

راہِ وفا کا رہرو ہوں میں کانٹوں پر چلنا ہے مجھ کو
کرب و بلا سے ڈرنے والا ہرگز میرے ساتھ نہ آئے

راہ نوردو! آ سکتے ہیں جاں بازی کے سخت مراحل
یوں کٹ جانا راہِ وفا میں لاش بھی ڈھونڈے ہاتھ نہ آئے

اس مذہب کا باغی ہوں میں جو اپنے اربابِ ہمم کو
رزم گہِ جلوت سے اٹھا کر گوشۂ خلوت میں لے جائے

نغمہ و لَے کے متوالوں کو صاحبِ وجد و حال تو دیکھا
لیکن ان "خاصانِ خدا" سے رزم کے میداں خالی پائے

فضلِ خدا سے رشتہ توڑے شرکِ جلی سے ناطہ جوڑے
دیر سے بیٹھا ہے اک صوفی قبرِ ولی پر آس لگائے

چھوڑ گئی تثلیث کو پیچھے تیز قدم توحید ہماری
ہم نے مٹّی کے ڈھیروں پر ماتھے ٹیکے پھول چڑھائے

قبروں پر جب میلے دیکھے تب یہ بات سمجھ میں آئی
بن جاتے ہیں ناداں انساں کس آسانی سے چوپائے

اللہ اللہ عصرِ نو کے ـــــ اہلِ بصیرت کا یہ عالم
اس کو مجرم تبلاتے ہیں جو منزل کی راہ بتائے

عام مثلِ نشّۂ بادہ گمراہی بھی ایک نشہ ہے
جن کو اپنا ہوش نہیں ہے کیسے انھیں کوئی سمجھائے
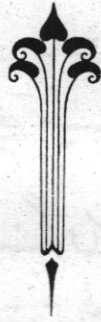
دل پہ وہ وقت بھی کس درجہ گراں ہوتا ہے
ضبط جب داخلِ فریاد و فغاں ہوتا ہے

کیسے بتلائیں کہ وہ درد کہاں ہوتا ہے
خون بن کر جو رگ و پے میں رواں ہوتا ہے

عشق ہی کب ہے جو مانوسِ زباں ہوتا ہے
درد ہی کب ہے جو محتاجِ بیاں ہوتا ہے

جتنی جتنی ستمِ یار سے کھاتا ہے شکست
دل جواں اور جواں اور جواں ہوتا ہے

واہ کیا چیز ہے یہ شدّتِ ربطِ باہم
بارہا خود پہ مجھے تیرا گماں ہوتا ہے

کتنی پامال اُمنگوں کا ہے مدفن مت پوچھ
وہ تبسّم جو حقیقت میں فغاں ہوتا ہے

عشق سر تا بہ قدم آتشِ سوزاں ہے مگر
اس میں شعلہ نہ شرارہ نہ دھواں ہوتا ہے

کیا یہ انصاف ہے اے خالقِ صبحِ گلشن
کوئی ہنستا ہے کوئی گریہ کناں ہوتا ہے

غم کی بڑھتی ہوئی یورش سے نہ گھبرا عامرؔ
غم بھی اک منزلِ راحت کا نشاں ہوتا ہے

کس نے دیکھی ہے کس نے جانی ہے
منزلِ عشق — لامکانی ہے

جس کو چاہا دیا دیا — نہ دیا
غم پہ بھی تیری حکمرانی ہے

میں ہوں اب اس مقام پر کہ جہاں
نامرادی ہی — کامرانی ہے

وہ جو سمجھیں تو اشک سب کچھ ہیں
وہ نہ سمجھیں تو صرف پانی ہے

بارہا جبرِ عشق سے — عام
عقل نے دل کی بات مانی ہے

سر میں نیازِ عشق کا سودا ترے لیے
سینے میں اضطرابِ تمنّا ترے لیے

دنیا ترے لیے غمِ دنیا ترے لیے
گویا کہ زندگی کا خلاصہ ترے لیے

تو گلستانِ دہر میں ہر گُل سے ہم کنار
میں بزمِ کائنات میں تنہا ترے لیے

تو رسمِ التفات کو سمجھا کیا گناہ
میں نے غموں کو دل سے لگایا ترے لیے

فرصت نہ تھی اگرچہ غمِ روزگار سے
پیمانِ عشق پھر بھی نبھایا ترے لیے
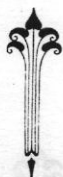
شکستِ دل سے خرد نے شکست کھائی ہے
کہاں کی چوٹ کہاں جا کے رنگ لائی ہے

ہنسا ہوں میں تو گلوں نے ہنسی اُڑائی ہے
وہ مُسکرائے تو شبنم بھی مُسکرائی ہے

خوشی کو دامِ الم سے کہاں رہائی ہے
کِھلا ہے پھول تو غنچے کو موت آئی ہے

نظر نے سیکڑوں جلوے چرا لیے لیکن
متاعِ حُسن میں کوئی کمی نہ آئی ہے

گئی ہے جو بھی نظر جلوہ گاہِ جاناں تک
زفرق تا بقدم ــــ حسن بن کے آئی ہے

سبق ملا یہ جہاں بھر کی ٹھوکریں کھا کر
طلب کی آخری منزل شکستہ پائی ہے

کتنا عجیب وصلِ بہار و خزاں ہے آج
جھوٹی خوشی کی دُھن میں چمن نوحہ خواں ہے آج

ہر نغمۂ نشاط فغاں در فغاں ہے آج
احساس پر تخیّلِ راحت گراں ہے آج

مغموم ہے ہوس کے تھپیڑوں میں حسنِ دوست
آواز دو کہ عشق کی غیرت کہاں ہے آج

میرے سکوتِ غم پہ تعجّب نہ کر یہ دیکھ
کل تک جو بے زباں تھا سراپا زباں ہے آج

عاؔمر یہی تو وقت ہے دے دے تڑپ کے جان
ان کی نظر سے تیری تمنّا عیاں ہے آج

یہ قدم قدم بلائیں
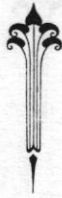
کبھی تو عشق ہمارے بھی کام آ جائے
وہ مُنہ سے کچھ نہ کہیں اور پیام آ جائے

خدا گواہ کہ ــــ عُمرِ ابد سے بہتر ہے
وہ زندگی جو محبّت کے کام آ جائے

حریصِ عرضِ تمنّا! ــــ یہ انتظار تو کر
نظر کو عشق کا طرزِ کلام آ جائے

غرورِ عجز بھی ہے بندگی کا ایک مقام
مگر خدا نہ کرے یہ مقام آ جائے

وہ فیضیابِ درِ میکدہ ہوں میں عاؔمر
نظر اٹھا دوں تو گردش میں جام آ جائے

عشق کے مراحل میں وہ بھی وقت آتا ہے
آفتیں برستی ہیں دل سکون پاتا ہے

آزمائشیں اے دل سخت ہی سہی لیکن
یہ نصیب کیا کم ہے، کوئی آزماتا ہے

عمر جتنی بڑھتی ہے اور گھٹتی جاتی ہے
سانس جو بھی آتا ہے لاش بن کے جاتا ہے

آبلوں کا شکوہ کیا ٹھوکروں کا غم کیسا
آدمی محبّت میں سب کو بھول جاتا ہے

کارزارِ ہستی میں عزّ و جاہ کی دولت
بھیک میں نہیں ملتی آدمی کماتا ہے

اپنی قبر میں تنہا آج تک گیا ہے کون
دفترِ عمل عاؔمر ساتھ ساتھ جاتا ہے

نظمیں

نیرؔ دعوتِ حق تیری تجلّی کے نثار
اپنے اندر کا صنم خانہ نظر آیا ہے

اے کہ تو!

اے کہ تو وادیِ ظلمت میں ہے مینارۂ نور
میں تہی دست ہوں کیا پیش کروں تیرے حضور

تجھ کو معلوم تو ہوگا کہ میرا آئینہ
ہو چکا میرے ہی اوہام کی بوچھار سے چور

تجھ کو معلوم تو ہوگا کہ مری دنیا میں
روشنی کی نہیں کوئی بھی کرن پاس نہ دور

تحفۂ نعت ہی لاؤں تو کہاں سے لاؤں
زہر سے پاک نہ سینہ، نہ تخیّل نہ شعور

اے کہ توڑا ہے ترے فقر نے شاہی کا غرور
میں تہی دست ہوں کیا پیش کروں تیرے حضور

چند الفاظ کے موتی ہیں مرے دامن میں
ہے مگر تیری محبّت کا تقاضا کچھ اور

صرف ایمان کے نعرے ہیں مرے ہونٹوں پر
ہے مگر تیری اطاعت کا تقاضا کچھ اور

ہیں مرے شوق کی معراج درود اور سلام
ہے مگر تیری شریعت کا تقاضا کچھ اور

دل عقیدت کی تب و تاب سے خالی تو نہیں
ہے مگر عشق کی غیرت کا تقاضا کچھ اور

نہ غلامی کا سلیقہ ہے نہ جینے کا شعور
میں تہی دست ہوں کیا پیش کروں تیرے حضور

میں نے تجھ سے کبھی پیمانِ وفا باندھا تھا — وہ مگر قصۂ ماضی کے سوا کچھ بھی نہیں
بجھ گئی شمعِ یقیں، سرد ہُوا سوزِ دروں — موجِ عصیاں کے تھپیڑوں کے سوا کچھ بھی نہیں
یاد تو آج بھی ہے نعرۂ تکبیر کی گونج — ایسی یادوں کا مگر ذکر ہی کیا کچھ بھی نہیں
جنسِ اخلاص کو طوفانِ ہوس لے ڈوبا — اب کوئی قول و قسم عہدِ وفا کچھ بھی نہیں

میری نظروں سے ہوئی اپنی حقیقت مستور
میں تہی دست ہوں کیا پیش کروں تیرے حضورؐ

ہر نئے دور میں دل اور زباں کے مابین — فاصلے اور بڑھے اور بڑھے اور بڑھے
حسنِ کردار کی پونجی تو گھٹی روز بروز — جن سے سرکار نے روکا تھا وہی طور بڑھے
اب مرے ہاتھ میں نیزا ہے نہ تلوار نہ ڈھال — کیوں نہ پھر اہلِ ستم کا ستم و جور بڑھے
میں تو اک جامِ سفالیں کا بھی حقدار نہیں — کس لیے میری طرف ساغرِ بلور بڑھے

خونِ انصاف مشیّت کا نہیں ہے دستور
میں تہی دست ہوں کیا پیش کروں تیرے حضورؐ

میں کسی اور کو الزام نہیں دے سکتا — اپنی تاریخ کو خود قتل کیا ہے میں نے
تو نے جس زہر سے بچنے کی ہدایت کی تھی — اپنے ہاتھوں سے وہی زہر پیا ہے میں نے
دل کی دنیا ہے تصاویرِ بتاں سے آباد — صرف ہونٹوں سے ترا نام لیا ہے میں نے
کھا چکی زنگ مرے ذوقِ عمل کی شمشیر — راستہ خود ہی تباہی کو دیا ہے میں نے

نہ مقدر کی خطا ہے نہ زمانہ کا قصور
اے کہ تو وادیٔ ظلمت میں ہے مینارۂ نور
میں تہی دست ہوں کیا پیش کروں تیرے حضورؐ

رُوداِدِ اَلم

اے ماہِ عرب، اے نورِ عجم، اے ختمِ رُسل، اے شاہِ اُمم
پامال و پریشاں اُمّت پر کب ہوگی نگاہِ لطف و کرم

اس تیرے تغافل کے صدقے لائق تو نہیں انعام کے ہم
اتنا ہی مگر احسان سہی رہ جائے سیہ بختی کا بھرم

اے مخزنِ رحمتِ ابرِ کرم! اے خیرِ سراپا! حسنِ اتم!
ادنیٰ سا تصرّف کافی ہے پھر کیسی فغاں پھر کس کا الم

مایوس نگاہوں سے کب تک یہ منظرِ عبرت دیکھیں ہم
ایک دَیر نیا تعمیر ہوا اک ٹوٹ گئی دیوارِ حرم

طوفاں ہیں کہ ٹوٹے پڑتے ہیں کشتی ہے کہ ڈوبی جاتی ہے
محرومِ عمل ملّاحوں میں طاقت ہے نہ بَل ہمّت ہے نہ دم

ہیں خوف کی شدّت سے لرزاں مشہور تھی جن کی بے باکی
ہیں پست و ذلیل و خوار و زبوں مشہور تھا جن کا جاہ و حشم

جن پاک سروں کی عظمت سے اعزاز ملا سرداری کو
اک لذتِ فانی کی خاطر وہ سر ہیں درِ اغیار پہ خم

معمار تھے جو مستقبل کے روتے ہیں گزشتہ عظمت کو
بے باک تھی جن کی بت شکنی ہنستے ہیں اُنھیں پتھّر کے صنم

جو مال و متاعِ دنیا کو تحقیر سے دیکھا کرتے تھے
اُن شیر دلوں کی اولادیں ہیں عاشقِ حسنِ دام و درم

دل ہو بھی چکا ٹکڑے ٹکڑے، حد ہو بھی چکی بربادی کی
کمزور کہاں تک جھیلیں گے اپنوں کی جفا غیروں کے ستم

بس ایک اشارہ نازک سا بس ایک توجّہ ہلکی سی
پھر تیری نظر کے مستوں کو کس چیز کا ڈر کس بات کا غم

اے نجمِ سحر ا ہے عامؔ بھی شیدائے جمالِ نادیدہ
شاید کہ تجھے رحم آجائے فریاد ہے لب پہ آنکھ ہے نم

نیرِ دعوتِ حق تیری تجلّی کے نثار

یہ نظم ۱۹۷۴ء میں منعقد ہونے والے جماعت اسلامی ہند کے
کل ہند اجتماع (دہلی) کے لیے لکھی گئی تھی

رہرو و جشن کہ منزل کے نشاں ابھرے ہیں
مے کشو! رقص کہ میخانہ نظر آیا ہے

کوہِ فاراں کی بلندی پہ جو چمکا تھا کبھی
پھر وہی ___ جلوۂ جانانہ نظر آیا ہے

جس سے چھلکی تھی کبھی وحدتِ آدم کی شراب
مدّتوں بعد وہ پیمانہ نظر آیا ہے

چھوڑ کر شہرِ ہوس عشق کے ویرانے میں
کوئی وحشی کوئی دیوانہ نظر آیا ہے

عشق اک محفلِ فردا کو سجانے کے لیے
عیشِ امروز سے بیگانہ نظر آیا ہے

یہ مرا حسنِ نظر ہے کہ ___ تمنّا کا فریب
فقر با سطوتِ شاہانہ نظر آیا ہے

گھُپ اندھیرے میں چمکتے ہوئے جگنو کی طرح
ایک بھولا ہوا افسانہ نظر آیا ہے

اک ذرا غُرفۂ ظُلمت سے جو پردہ سرکا
نگہِ شوق کو کیا کیا نہ نظر آیا ہے

نیّرِ دعوتِ حق تیری تجلّی کے نثار
اپنے اندر کا صنم خانہ نظر آیا ہے

خوابُ اور تعبیر

کتنے پرکیف تھے وہ رات میں دیکھے ہوئے خواب
رنگ وطلعت کے جلو میں مہ و پرویں کے قریب
تختِ طاؤس پہ وہ پیکرِ صد حسن و شباب
جس کے ہر جلوۂ رنگیں سے نگاہیں خیرہ
جس کی ہر جنبشِ لب سازِ جنوں کی مضراب
ہر ادا رقصِ دل و رُوح کا پیغام لیے
ہر نظر دعوتِ مے خانۂ خیّام لیے
وہ سیہ زلف کہ بکھرے تو زمانہ سو جائے
اور سمٹے تو دلِ کوہ و دمن جاگ اُٹھے
وہ لب و لعل کہ کھولیں جو تبسّم کی گرہ
نکہت و نور کی خوابیدہ چبھن جاگ اُٹھے
عطرِ شبنم سے مہکتے ہوئے عارض کے گلاب
موجِ در موج اُمنڈتا ہوا طوفانِ شباب
اور پھر غُل ہوا اٹھو! سحرِ نو آئی
وہ پھٹی پو، وہ سیاہی کا جگر چاک ہوا
وہ اٹھا خاورِ تاباں افقِ مشرق سے
نور کی رَو میں اندھیرا خس و خاشاک ہوا

اب اجالے ہی اجالے کی حکومت ہوگی
ختم آلامِ شبِ غم کی حکایت ہوگی

کھُل گئی آنکھ تو خوابوں کا فسوں ٹوٹ گیا
نہ وہ زہرائے فلک تھی نہ وہ جلوے نہ بہار
سحرِ تازہ کی بڑھتی ہوئی تنویر کے ساتھ
چھاگیا حدِّ نظر تک غمِ دوراں کا غبار
سیلِ افکار میں خوابوں کے محل ڈوب گئے
مسکراتے ہوئے جلوؤں کے کنول ڈوب گئے

آؤ اے ہم نفسو! مل کے ذرا غور کریں
خواب اور خواب کی تعبیر میں یہ فرق ہی کیوں
جس کو تابانیِ کامل کا امیں سمجھے تھے
اسی خورشید کی تنویر میں یہ فرق ہے کیوں
فکر و کاوش میں اگر عزم بھی شامل ہو جائے
کیا تعجّب ہے کہ حل عقدۂ مشکل ہو جائے

خواب ڈھل سکتے ہیں تعبیر کے پیمانے میں
ہو اگر شوقِ طلب، سوزِ وفا جذب و یقیں
قوّتِ جہد و عمل وہ ہے کہ خاکی انساں
اپنے قدموں پہ جھکا سکتا ہے تاروں کی جبیں
آؤ ماتم کے عوض جرأتِ پیکار کریں
بڑھ کے اِن مسخ اجالوں پہ کوئی وار کریں

ہائے یہ گردشِ دوراں!

ہائے یہ گردشِ دوراں مجھے لائی ہے کہاں
ہے فضاؤں میں دھواں سانس بھی لینا ہے گراں

نور کے نام پہ — بکتی ہے یہاں تاریکی
لوگ کہتے ہیں خزاؤں کو یہاں فصلِ بہار
علم ہے خاک بسر زخم بہ دل آہ بہ لب
جہل لے سر پہ سجائی ہے کلاہ و دستار
حسنِ کردار کا — نیلام ہے چوراہوں پر
عصمتِ لوح و قلم بیچ رہے ہیں — فن کار
بے ضمیری کے لیے عام ہے صہبائے نشاط
ہدفِ سنگِ ملامت ہے ضمیرِ بیدار

ناطقہ سر بگریباں ہے، خرد نوحہ کناں
ہائے یہ گردشِ دوراں مجھے لائی ہے کہاں

باغباں کہتا ہے ـــــ جب برق چمکتی دیکھو
خیر مقدم کو اٹھو برقِ پہ خرمن رکھ دو
آتشِ گل کو ضرورت ہو اگر ـــــ ایندھن کی
اس کے آغوش میں اپنا ہی ـــ نشیمن رکھ دو

خار جب آئیں نظر مشقِ ستم پر مائل
سامنے اطلس و کمخواب کے دامن رکھ دو
اور صیّاد اگر ـــــ تیغ بکف آجائے
تیغ کو پیار کرو ـــــ دھار پہ گردن رکھ دو
نہ سنی جائے چمن میں کہیں آوازِ فغاں
ہائے یہ گردشِ دوراں مجھے لائی ہے کہاں

ہر تہی مغز کو ہے ـــــ غرّۂ علم و تحقیق
ہر مہاجن کو یہاں دعوۂ رزّاقی ہے
کاسۂ سر سے بنا سکتا ہو جو ساغرِ مے
ایسا ہر شخص یہاں اپنی جگہ ساقی ہے
طنز و تحقیر کے تیروں کا ہدف ہیں وہ لوگ
جن میں خودداری و غیرت کی رمق باقی ہے
فکرِ کوتاہ کو ملتے ہیں یہاں حور و قصور
اور معتوب ہے وہ فکر جو آفاقی ہے
فہم و دانائی کے سرخیل بنے ہیں ناداں
ہائے یہ گردشِ دوراں مجھے لائی ہے کہاں

جرأتِ حق نگری ـــــ موجبِ تعزیر بنی
ظلم سے جنگ سزاوارِ سلاسل ٹھہری
کتنے زہروں کو یہاں قند کہا جاتا ہے
قندِ انصاف مگر ـــــ زہرِ ہلاہل ٹھہری
بے شعوروں کی نگارش پہ جوابی تنقید
جرم و تقصیر کی فہرست میں ـــــ شامل ٹھہری
چاپلوسی کو ہوئی ـــــ خلعتِ زربفت عطا
صاف گوئی ـــــ رسن و دار کے قابل ٹھہری
سرِ بازار ملا ـــــ جھوٹ کو سچ کا عنواں
ہائے یہ گردشِ دوراں مجھے لائی ہے کہاں

شہر یاری کی حدوں سے بھی گزر کر دیکھا
ہر طرف ایک سا عالم ہے کوئی فرق نہیں
زہد کے دستِ مبارک میں ہے جامِ پندار
تمکنت سے شکن آلود ہے تقویٰ کی جبیں
اہلِ تحقیق ہیں اوہام کی زلفوں کے اسیر
اہلِ دانش کے دماغوں میں تعصّب ہے مکیں
اہلِ دل مستیٔ کردار سے محروم ہوئے
برگِ افیون ـــــ اُگلتی ہے تصوّف کی زمیں
ہیں طریقت کے مسائل پہ فرشتے حیراں
ہائے یہ گردشِ دوراں مجھے لائی ہے کہاں

اہلِ ایماں نے مساجد تو سجائی ہیں بہت
قصۂ دوش ہوا ـــــ رشتۂ عبد و معبود
تھے کبھی عرش کی دہلیز پہ جن کے سجدے
آج اپنے ہی مفادات ہیں ان کے مسجود

جن کی تکبیر تھی ـــــ اک زلزلۂ کوہ شکن
آج اک شیشۂ صد پارہ ہے خود ان کا وجود
اہلِ مکتب ہیں مباحث کے خم و پیچ میں گم
سوزِ دل، نورِ یقیں، ذوقِ عمل ہے مفقود

عام ہے اہلِ مدارس میں عداوت کی زباں
ہائے یہ گردشِ دوراں مجھے لائی ہے کہاں

بھیک

کل بصد عجز و ادب ایک بڑے تاجر سے
عرض کی میں نے ــــــ "تجلّی"[1] کی اعانت کیجیے
اس کا مقصد ہے کہ ہوں نیند کے سوتے بیدار
آپ اس مقصدِ زرّیں کی ــــــ حمایت کیجیے
فرض ہے دین کی تبلیغ ــــــ مسلمانوں پر
جتنا مقدور ہو، مذہب کی اشاعت کیجیے
ہم ہیں نادار مگر ــــــ مگر عزم جواں رکھتے ہیں
آپ زردار ہیں دولت سے کفالت کیجیے

ہو اگر عذر کوئی خدمت اعزازی میں
صرف سالانہ خریداری کی زحمت کیجیے

---

[1] مولانا کے رسالے کا نام یہ عدم عدم بلائیں

ہنس کے فرمایا کہ اے عامِرِ فرسودہ خیال
تو ابھی تک ہے اسیرِ غمِ کفر و اسلام
تیرے اعصاب پہ طاری ہے قدامت کا جنوں
ہیں ترے دیدۂ و دل فرقہ پرستی کے غلام

اسپِ تہذیب و ترقی تو کہاں تک پہنچا
تو لیے پھرتا ہے صدیوں کے پرانے اوہام
دیکھ اس وقت زمانہ کے تقاضے کیا ہیں
کون سی چیز ہے جس چیز کے طالب ہیں عوام
آج دنیا کو ضرورت ہے ــــ رواداری کی
بامِ مسجد کی فصیلوں پہ سجا دے اصنام
صوتِ آذان کو ناقوس کی تانوں سے ملا
ہے یہ بے وقت کی شہنائیٔ حلال اور حرام
آج کل ایک بجی چیز ہے مذہب و ذہب
وعظ و تبلیغ و ہدایت کے ہو قضیوں کو سلام
متّحد قوم کی تشکیل کا وقت آیا ہے
نشر ہوتے ہیں وسیعُ النظری کے تازہ پیغام

ہند کے دامنِ راحت میں اگر رہنا ہے
بر سرِ عام نہ لے دین کی ــــ تبلیغ کا نام

ہ بعض قصبوں میں اذان کو ”آذان“ بھی بولا جاتا ہے۔
یہ قدم قدم بلائیں

عرض کی میں نے کہ ــــ "قبلہ نے بجا فرمایا"
جانتا میں بھی ہوں اس دور کے تازہ حالات
میں بھی ہوں فتنہ و تفریق و تعصّب کے خلاف
بغض و کینہ سے بہت دور ہے مومن کی حیات
میں بھی ہوں معترفِ امن و اُخوّت لیکن
مجھ سے ہو سکتی نہیں بندگیِ لات و منات
قیمتی چیز ہے دل جوئیِ اربابِ وطن
خوب ہے متحدہ قوم کے پرچار کی بات
دین و مذہب کو مگر ــــ آپ غلط سمجھے ہیں
دین و مذہب ہی میں پوشیدہ ہے قوموں کی نجات
وعظ و تبلیغ کا مفہوم نہیں دار و گیر
شورش و فتنۂ ہنگامہ نہیں جشنِ برات

بولے بس خیر! ــــ ہمیں بحث نہیں کرنی ہے
پاسِ خاطر کے لیے کچھ تجھے دینا ہے ضرور
ویسے اچھّا تو یہی تھا کہ رسالے کے عوض
چھیڑتا کارِ تجارت کوئی حسبِ مقدور
آج کل دین کا بازار ــــ بہت مندا ہے
ہو رسالہ بھی تو فلمی اُسے ہونا ہے ضرور
دس کا اک نوٹ بڑھاتے ہوئے ارشاد کیا
لے اِسے خرچ میں لا، جیسے تجھے ہو منظور

نوٹ وہ بخششِ زردار ——— الٰہی توبہ !
جیسے بھٹی کا دہکتا ہوا ——— انگارہ ہو
بھیک ، احسان و کرم داد و دہش لطف و عطا
جیسے محتاج و گدا عام بے چارہ ہو
میں نے چندہ کی جگہ بھیک نہیں مانگی تھی
بھیک دو اس کو جو محتاج ہو نا کارہ ہو
ایسے اندازِ نوازش پہ ہزاروں لعنت
جس سے خودداریٔ مفلس کا جگر پارہ ہو

لے لیا نوٹ مگر لے کے وہیں پھاڑ دیا
اپنے افلاس کی غیرت کا علم گاڑ دیا

پیغام

مولانا کی یہ نظم ۱۹۴۷ء سے پہلے دیو بند کے ہر جلسے میں سُنی جاتی تھی

یا رنج و بلا کا خوف نہ کر، یا نام نہ لے آزادی کا
جب ولولۂ پرواز نہیں الزام نہ لے آزادی کا

آزادی کو تلواروں کی آغوش میں پالا جاتا ہے
آبادی کو بربادی کے سانچوں میں ڈھالا جاتا ہے
میدانِ وفا میں جینے کا ارمان نکالا جاتا ہے
غیرت کے سنہرے پرچم کو سر دے کے سنبھالا جاتا ہے

یا فلسفۂ لَا تَحزَن کی تاویل نہ کر شمشیر اُٹھا
یا اپنے سرِ ناکارہ سے یہ تہمت دار و گیر اُٹھا

دریائے سکون و راحت میں طوفان ہزاروں آئینگے
ہستی کے مسرّت خانوں پر تیغوں کے الم لہرائینگے
ماں باپ کی آنکھوں کے آگے اولاد کے سر کٹ جائینگے
اربابِ وطن کے سینوں میں دل لرزیں گے تھرّائینگے

گم ہوں گے کتابِ ہستی سے ایمان و وفا کے افسانے
خود شمع بجھانے کی خاطر یلغار کریں گے پروانے

گڑ جائے گا سینوں میں پرچم، خنجر کی چمکتی دھاروں کا
پی پی کے لہو انسانوں کا متلائے گا جی تلواروں کا
پرسانِ اَلم ہو گا نہ کوئی مُردوں کے سوا بیماروں کا
چھپ جائیں گے ڈر کر شمس و قمر رُخ زرد پڑے گا تاروں کا

ہر گام پہ توپیں گرجیں گی ہر بام پہ گولے برسیں گے
ہر شاخ جلا دی جائے گی ہر نخل پہ اولے برسیں گے

بڑھنا ہے اگر اس میداں میں ہر غم کو بھلا کر آگے بڑھ
ایمان و یقیں کو قسمت کی تحریر بنا کر آگے بڑھ
آہنگِ نفس سے غلغلۂ تکبیر اُٹھا کر آگے بڑھ
اپنے ہی دھڑکتے سینہ پر اک زخم لگا کر آگے بڑھ

وہ نعرہ لگا تو میداں میں شیروں کے بھی سینے پھٹ جائیں
ہر جُنبشِ چشم ابرو سے شیطان کے لشکر کٹ جائیں

مانا کہ بساطِ عالم پر مجبور ہے تو لاچار ہے تو
باطل کے عساکر کے آگے ٹوٹی ہوئی اک تلوار ہے تو
آباد ہیں وہ برباد ہے تو، زردار ہیں وہ نادار ہے تو
وہ رُوئے زمیں کے مالک ہیں اور دوشِ زمیں پر بار ہے تو

لیکن یہ جہاں سب تیرا ہے، تاریخِ سلف دہراتا چل
ایمان و عمل کے بربط پر، اسلام کا نغمہ گاتا چل

سُرخ ستارہ

تم سمجھتے ہو یہ شب آپ ہی ڈھل جائے گی
خود ہی اُبھرے گا نئی صبح کا زرّیں پرچم
میں سمجھتا ہوں کسی صبحِ درخشاں کے عوض
پھر کی ایک نئی رات کو دے گی یہ جنم
اور اس رات کی تاریکی میں کھو جائیں گے
مکتب و خانقاہ و دیر و کلیسا و حرم
دیو ظلمات کی ٹھوکر سے نہ پائیں گے پناہ
یہ شِوالے، یہ مساجد، یہ پجاری، یہ صنم
رکھ دیے جائیں گے شمشیر کے زیرِ سایہ
دستِ ماتم لبِ فریاد، زبان و تنقید
برف جم جائے گی افکار کے گلزاروں پر
یخ ہواؤں میں ہی جم جائے گی کِشتِ اُمّید
چاندنی ظلمتِ سیّال میں ڈھل جائے گی
رات کی مانگ سنوارے گی شعاعِ اُمّید
اہلِ فن دیں گے اندھیروں کو اُجالوں کا لقب
زہر کو قند، محرّم کو کہا جائے گا عید

یہ مرا وہم نہیں، ناول وا فسانہ نہیں
دوستو! غور کرو، اور نگاہیں تو اُٹھاؤ
وہ جو اِک سُرخ ستارہ ہے افق کے نزدیک
کچھ تمھیں علم ہے کس رُخ پہ ہے اس کا پھیلاؤ
کاش تم اس کی حقیقت پہ نظر ڈال سکو
ہے یہ اک آتشِ صد برق بداماں کا الاؤ
اس کی کرنوں میں ہے چلتی ہوئی تلوار کی کاٹ
اس کی سُرخی میں ہے اُمڈے ہوئے دریا کا بہاؤ
اس کے دامن میں ہے آسُودہ وہ فتنہ جس سے
جسم تو جسم —— میسّر نہیں روحوں کو اماں
دل، نظر، ذہن، خیالات، اصول و اقدار
سب کے سب اسکی تگ و تاز سے لرزاں ترساں
اسکی پرچھائیں بھی پڑ جائیں تو سبزہ جل جائے
دیکھتے دیکھتے ماحول پہ چھا جائے دھواں
اس کے شعلوں کا تو کیا ذکر کہ شعلے ٹھہرے
اس کی شبنم بھی گلستاں کے لیے برق تپاں

بغاوت

آج بھی میرے خیالوں کی تپش زندہ ہے
میرے گفتار کی دیرینہ روش زندہ ہے
آج بھی ظلم کے ناپاک رواجوں کے خلاف
میرے سینے میں بغاوت کی خلش زندہ ہے

جبر و سفّاکی و طغیان کا باغی ہوں میں
نشّۂ قوّتِ انسان کا باغی ہوں میں

جہل پروردہ یہ قدریں یہ نرالے قانون
ظلم و عدوان کی ٹکسال میں ڈھالے قانون
تشنگیٔ نفس کے جذبوں کی بجھانے کے لیے
نوعِ انساں کے بنائے ہوئے کالے قانون

ایسے قانون سے نفرت ہے عداوت ہی مجھے
ان سے ہر سانس میں تحریکِ بغاوت ہی مجھے

تم ہنسو گے کہ یہ کمزور سی آواز ہے کیا
جھنجھنایا ہوا، تھرّایا ہوا ساز ہے کیا
جن اسیروں کے لیے وقف ہیں سونے کے قفس
ان میں موجود ابھی خواہشِ پرواز ہے کیا؟

آہ! تم فطرتِ انسان کے ہمراز نہیں
میری آواز، یہ تنہا مری آواز نہیں

ان گِنت روحوں کی فریاد ہے شامل اس میں
سسکیاں بنکے دھڑکتے ہیں بہت دل اسمیں
تہ نشیں موج یہ طوفان بنے گی اِک دن
نہ ملے گا کسی تحریک کو ساحِل اس میں

اس کی یلغار مری ذات پہ موقوف نہیں
اس کی گردش مرے دن رات پہ موقوف نہیں

ہنس تو سکتے ہو، گرفتار تو کر سکتے ہو
خوار و رسوا سرِ بازار تو کر سکتے ہو
اپنی قہّار خدائی کی نمائش کے لیے
مجھ کو نذرِ رسن و دار تو کر سکتے ہو

تم ہی تم قادرِ مطلق ہو خدا کچھ بھی نہیں
جسمِ انساں میں دماغوں کے سوا کچھ بھی نہیں

آہ! یہ سچ ہے کہ ہتھیار کے بَل بوتے پر
آدمی نادر و چینگیز تو بن سکتا ہے
ظاہری قوّت و سطوت کی فراوانی سے
لینن و ہٹلر و انگریز تو بن سکتا ہے

سخت دشوار ہے انساں کا مکمّل ہونا
حق و انصاف کی بنیاد پہ افضل ہونا
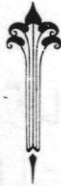
سحر ہو بھی چکی

دھوم تھی، شور تھا جس کا وہ سحر ہو بھی چکی
محفلِ ظلمتِ شب، زیر و زبر ہو بھی چکی

جوں کی توں سرد فضاؤں میں ہیں کہرے کی تہیں
چند کو چھوڑ کے تاریک ہیں سب بارگہیں
زلفِ شب گوں ہے وہی پردۂ رخسارِ حبیب
اور فرمانِ مشیّت ہے اسے صبح کہیں

راستے گُم ہیں اُجالوں کا کلیجہ شق ہے
گرد ہی گرد ہے خورشید کا چہرہ فق ہے

آج بھی فکر کا انداز وہی ہے کہ جو تھا
ہر طرف بابِ ریا باز وہی ہے کہ جو تھا
محفلِ ناز نے مطرب تو بدل ڈالے ہیں
لے وہی، گیت وہی، ساز وہی ہے کہ جو تھا

سُر وہی، تال وہی، رُوح شکن راگ وہی
وہ سپیرے نہ سہی، بین وہی ناگ وہی

اب بھی اوہام کے اسٹیج پہ رقصاں ہے سماج
علم کے سر پہ ہے فرسودہ روایات کا تاج
سج گئی محفلِ آئینِ سَرِ لوح و قلم
اور افکار کی دنیا میں صف آرا ہے خراج

عالمِ نزع میں ہے عصمتِ کردار و عمل
عارضِ جہد پہ ہے حرص و ہوا کا آنچل

کھو گیا وادئ ظلمات میں انساں کا ضمیر
نہ نوائے سحری ہے، نہ فغانِ شب گیر
آتما چیخ رہی ہے کوئی سنتا ہی نہیں
اندروں سرد ہے باہر سے دہکتے ہیں شریر

دھول اُڑتی ہے محبّت کے گلستانوں میں
گھُپ اندھیرا ہے تخیّل کے نہاں خانوں میں

گرُدوارے بھی، شوالے بھی، مساجد بھی بہت
رام کے بھگت، بھی اللہ کے عابد بھی بہت

آؤ ہم ایک نئے دور کی تعمیر کریں
آہنی قلعۂ کردار کی تسخیر کریں
قصّۂ سیم و زر و آتشِ و فولاد کے ساتھ
مصحفِ خدمت و ایثار بھی تحریر کریں

صرف باہر نہیں اندر بھی اُجالا ہو جائے
بول آزادئ جمہور کا بالا ہو جائے

موجۂ طاعت و اخلاص کا پیا سا ہے چمن
ہُن اُگلنے کو ہے بیتاب مری خاکِ وطن
دستِ ہشیار نے بس گھول دیا ہے دانہ
آج بھی شہد میں امرت ہیں مرے گنگ و جمن

آؤ سر جوڑ کے ہم ایک بڑا کام کریں
دیو جو اپنے ہی اندر ہے اسے رام کریں

بزمِ زلف ولب و رخسار سجانے والو
جشنِ آزادیٔ جمہور منانے والو
کھو کھلے ہیں یہ در و بام یہ محراب و حریم
قعرِ کہنہ پہ نیا رنگ چڑھانے والو

جتنے اشجار بظاہر ہیں ثمر لائے ہوئے
وائے افسوس کہ اندر سے ہیں گھُن کھائے ہوئے

قافلۂ حُجّاج سے خطاب

سلام کے بعد ان سے کہنا کہ ہم نے اے سرورِ دو عالم
فضا میں ہر سُو اڑا دیئے ہیں، تمھاری نعت و ثنا کے پرچم
نہ دامنِ قیل وقال چھوڑا، نہ حسنِ تحریر میں کمی کی
بنے رہے ہیں، بنے رہیں گے، قلم سراپا زباں مجسّم
جہاں جہاں رہ گیا تھا سادہ ورق شریعت کا اتفاقاً
وہاں وہاں ہم نے بھر دیے ہیں نئے نئے رنگ اجتہاداً
چراغِ بے نور تھی شریعت، اسے طریقت کا نور بخشا
مجازِ بے کیف تھی عبادت، اسے حقیقت کا نور بخشا
جو طبل و چنگ و رباب و شاہد نہ تھے شریعت کے دائرے میں
ضیافتِ اہلِ دل کی خاطر، انھیں شریعت کا نور بخشا
تمھاری سیرت کی محفلوں کو، سجا دیا تا بحدِّ امکاں
تمھاری شہرت کو آسماں پر چڑھا دیا تا بحدِّ امکاں

عبادتوں میں نمک نہیں تھا، نمک دیا ہاؤ ہو سے ہم نے
لطائف نو بہ نو مرتب کیے بڑی جستجو سے ہم نے
گزر گئی کچھ بھی ہم پہ لیکن، کٹا نہ ایمان و دیں سے رشتہ
گنہ کیے ہیں نماز پڑھ کر، شراب پی ہے وضو سے ہم نے

قمار خانہ میں بھی گئے ہیں، تو دل نے پہلے اذان دی ہے
بغل میں قرآں دبائے رکھّا، اگر بتوں پر بھی جان دی ہے
یہ ان سے کہنا کہ ہم نے آقا، وفا کا وعدہ نبھا دیا ہے
تمھاری نعت و ثنا کا نغمہ ہزار طرزوں میں گا دیا ہے
نئے نئے فلسفے تراشے، نئے نئے زاویے نکالے
عقیدتوں کو فروغ دے کر تمھیں خدا سے ملا دیا ہے
نہ تھے فرشتے بھی جس پہ قادر، کیا وہ کارِ عظیم ہم نے
اَحَد کو احمدؐ سے ربط دے کر اڑا دیا صرف میم ہم نے
اگر کہیں وہ کہ اجتماعی نظام کی داستاں سُناؤ
مجاہدانِ جہاد پیشہ، کہاں سے پہنچے کہاں سُناؤ
وہ باغ پھولا پھلا تو ہوگا جو ہم نے، سینچا تھا خونِ دل سے
عروج و اقبال کا ستارا، ہے کس جگہ ضو فشاں سُناؤ
سُناؤ کیا رزمِ حق و باطل میں حق کا پلّہ ہے اب بھی بھاری؟
اقامتِ دین ہو رہی ہے؟ ہماری دعوت ہے اب بھی جاری؟
تو عرض کرنا بطرزِ حکمت، کہ اے شہنشاہِ دین و مِلّت
رہِ طریقت کے سالکوں کو، سلوک ہی سے کہاں ہے فرصت
وقار و عزّت کے سب خزانے، سپُردِ شیطان کر دیے ہیں
متاعِ دنیا سے واسطہ کیا، بہت ہے روحانیت کی دولت
مجاہدہ، دعوت و عزیمت، اقامتِ دیں، حق پرستی
یہ اصطلاحیں ہیں در حقیقت، بہت ہی ہلکی، بہت ہی سستی

ہماری منزل ہے ان سے آگے، فضائے ارض و سما سے اوپر
ہماری پرواز کی بلندی پہ جل رہے ہیں ہما کے شہ پر
ہماری سربستہ اصطلاحیں، جوابِ عنقا بنی ہوئی ہیں
ہماری جولانیوں کا میداں، ہے زندگی کی حدوں سے باہر

قیادتِ کاروانِ ہستی، لعین شیطان کو مبارک
بہار و کیف و سرور و مستی، ہمارے ایمان کو مبارک

خدا کا ارشاد ہے کہ مجھ کو، پسند ہے عجز و انکساری
اسی لیے حق شناس بندوں نے، کر لیا خود پہ ضعف طاری
تسلّط و اقتدار و حشمت، سیادت و قبضہ و حکومت
یہ سب ہیں دامِ ہوس کے پھندے، اسیر ہوتے ہیں ان میں ناری

ہمیں تو ہے فخر کمتری پر، جہاں میں سب سے ضعیف ہیں ہم
خدا کو زیبا ہے جاہ و عظمت، ذلیل ہیں ہم، نحیف ہیں ہم

کہا گیا ہے کہ ہے یہ دنیا، نگاہِ مومن میں قید خانہ
تو پھر یہاں کے برے بھلے میں، ضروری ہی کیا ہے سر کھپانا
بروں سے اللہ خود ہی لے گا، حساب ہر ظلم و معصیت کا
ہمارے سینوں میں روشنی ہے، بلا سے تاریک ہو زمانہ

حیاتِ دنیا ہے چند روزہ، گزر ہی جائے گی جیسے گزرے
اٹل ہیں تقدیر کے نوشتے، یہ کون سوچے کہ کیسے گزرے

اِلتجا

تم روٹھ چکے دل ٹوٹ چکا اب یاد نہ آؤ رہنے دو
اس محفلِ غم میں آنے کی زحمت نہ اٹھاؤ رہنے دو

یہ سچ کہ سہانے ماضی کے لمحوں کو بھلانا کھیل نہیں
یہ سچ کہ بھڑکتے شعلوں سے دامن کو بچانا کھیل نہیں
رِستے ہوئے دل کے زخموں کو دنیا سے چھپانا کھیل نہیں
اوراقِ نظر سے جلووں کی تحریر مٹانا کھیل نہیں

لیکن یہ محبّت کے نغمے اس وقت نہ گاؤ رہنے دو
جو آگ دبی ہے سینے میں ہونٹوں پہ نہ لاؤ رہنے دو

جاری ہیں وطن کی راہوں میں ہر سمت لہو کے فوّارے
دکھ درد کی چوٹیں کھا کھا کر لرزاں ہیں دلوں کے گہوارے
انگشت بہ لب ہیں شمس و قمر حیران و پریشاں ہیں تارے
ہیں بادِ سحر کے جھونکے بھی طوفانِ مسلسل کے دھارے

اب فرصتِ ناؤ نوش کہاں اب یاد نہ آؤ رہنے دو
طوفان میں رہنے والوں کو غافل نہ بناؤ رہنے دو

مانا کہ محبّت کی خاطر ہم تم نے قسم بھی کھائی تھی
یہ امن و سکوں سے دور فضا پیغامِ سکوں بھی لائی تھی
وہ دَور بھی تھا جب دنیا کی ہر شے پہ جوانی چھائی تھی
خوابوں کی نشیلی بدمستی معصوم دلوں پر چھائی تھی

لیکن وہ زمانہ دور گیا اب یاد نہ آؤ رہنے دو
جس راہ پہ جانا لازم ہے اس سے نہ ہٹاؤ رہنے دو

اب وقت نہیں اُن نغموں کا جو خوابوں کو بیدار کریں
اب وقت ہے ایسے نعروں کا جو سوتوں کو ہشیار کریں
دنیا کو ضرورت ہے انکی جو تلواروں کو پیار کریں
جو قوم و وطن کے قدموں پر قربانی دیں ایثار کریں

رُوداد محبّت پھر کہنا اب مان بھی جاؤ رہنے دو
جادو نہ جگاؤ رہنے دو فتنے نہ اٹھاؤ رہنے دو

میں زہرِ حقیقت کی تلخی خوابوں میں چھپاؤں گا کب تک
غربت کے دہکتے شعلوں سے دامن کو بچاؤں گا کب تک
آشوبِ جہاں کی دیوی سے یوں آنکھ چراؤں گا کب تک
جس فرض کو پورا کرنا ہے وہ فرض بھُلاؤں گا کب تک

اب تاب نہیں نظّارے کی جلوے نہ دکھاؤ رہنے دو
خورشیدِ محبّت کے رُخ سے پردے نہ اٹھاؤ رہنے دو

ممکن ہے زمانہ رخ بدلے یہ دورِ ہلاکت مٹ جائے
یہ ظلم کی دنیا کروٹ لے یہ عہدِ ضلالت مٹ جائے
دولت کے فریبی بندوں کا یہ کبر اور نخوت مٹ جائے
برباد وطن کے محلوں سے غیروں کی حکومت مٹ جائے

اس وقت بنامِ عہدِ وفا میں خود بھی تمھیں یاد آؤں گا
منھ موڑ کے ساری دنیا سے الفت کا سبق دہراؤں گا

یہ قدم قدم بلائیں

قرآن

رات ہنگامِ تہجّد کسی دیوانے نے
گر کے سجدے میں خدا سے یہ کہا رو رو کر

اے کہ تو خالقِ کونین ہے بے ہمتا ہے
ابنِ آدم کو نہیں تیری مشیّت سے مفر

کیا یہی تیری مشیّت ہے کہ دنیا میں کبھی
اب نہ آزاد ہو شیطان کے پنجہ سے بشر

دین و ایمان کے سفینوں کو کنارا نہ ملے
اور بڑھتے ہی رہیں قلزمِ باطل میں بھنور

ہائے یہ جلوہ گہِ ناز یہ تیری دنیا
ہر قدم کفر و بغاوت ستم و فتنۂ و شر

تیری قدرت کا یہ شہکار، یہ باغی انساں
کفر آمادہ، خطا کوش، ستم گر خود سر

مشرق و مغرب و قطبین، زمین و گردوں
یورشِ لشکرِ طاغوت سے ہیں زیر و زبر

ایک پُر ہول اندھیرا ہے فضاؤں پہ محیط
گم ہے ظلمات کے طوفان میں ہر راہ گزر

کچھ تو فرما کہ زمانہ کے یہ احوال ہیں کیوں
راز کیا ہے کہ نہیں تیرے تغافل پہ اثر

مجرموں کو نظر انداز کرے گی کب تک
تیری قہّار مشیّت کی پُر اسرار نظر

کیا اندھیرے میں بھٹکتا ہی رہے گا انساں
کیا کبھی رات کے پہلو سے نہ پھوٹے گی سحر

آئی آواز کہ سجدے سے ذرا سر تو اٹھا
حیف اے سرکش و درماندۂ و ناداں انساں
یہ ترا جوش تہی مایہ عمل سے محروم
یہ دعائیں کہ نہیں ان میں تب و تابِ حیات
عزم و کردار کی تلوار سے خالی یہ نیام
گرم پانی کے سوا کیا ہیں وہ آنسو جن میں
میری چوکھٹ پہ ترا سر تو جُھکا دل نہ جھکا

تیری کچھ بھی نہیں قانونِ مشیّت پہ نظر
یہ ترے شیون و فریاد بلا سوزِ جگر
یہ ترا گریۂ بے تاب تما شا یکسر
سیپ ہی سیپ ہے یکسر ترا صدف گوہر
اور تیری یہ تمنّا کہ ملے فتح و ظفر
بہ کے آئے نہ کوئی چارۂ دلِ لختِ جگر
بُت شکن خود کو سمجھتا ہے مگر ہے بُت گر

سُن! کہ ہم دیں گے نہیں تیرے سوالوں کا جواب
کیا کریں دیکھیے ترے پاس سماعت نہ بصر
جس کو بخشا گیا قرآن سا شہکارِ عظیم
حیف! اس کو نہیں اسرارِ مشیّت کی خبر

دورِ فاروقؓ
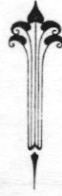
سوچتا ہوں کہ یہ کیا راز ہے اے ربِّ قدیر
آ کے اک بار گلستاں میں نہ پھر آئی بہار

ت نئے رنگ میں چلتی ہی رہی بادِ خزاں
سیکڑوں سال گزرتے ہی رہے تیرہ و تار

دورِ فاروق رضؓ جو بے گانہ تھا بیگانہ رہا
پھر نہ دیکھے نگہِ چرخ نے وہ لیل و نہار

کم نہ تھے دین میں عثمان رضؓ و علی رضؓ بھی لیکن
اور ہی کچھ تھی عمر رضؓ کے چمنستاں کی بہار

بدبہ، رعب، دُہل، دھاک، تجمل، دم خم
طنطنہ، عظمت و شوکت حشم و عزّ و وقار

من ایسا کہ نہ ہوں رات کو دروازے بند
بے نیازانہ بڑے چین سے سوئیں زردار

عدل وہ عدل کہ مجرم ہو اگر ابنِ عمرؓ
دستِ قانون کی تلوار بنے باپ کا پیار

ہلِ خیرات کو ڈھونڈے سے بھکاری نہ ملے
تیغِ سرمایہ سے گھائل نہ ہو محنت کا وقار

یٹھ پر لاد کے پہنچائے غریبوں کے اناج
کون؟ وہ جس کی اطاعت کو فرشتے تیار

سکے ادنیٰ سے اشارے پہ فلک کانپ اُٹھے
جس کا ایما ہو تو رک جائے زمیں کی رفتار

نکھ اُٹھ جائے تو ہِل جائیں پہاڑوں کے قدم
جوش آ جائے تو اڑ جائیں فضاؤں میں شرار

قر اس شان کا ملبوس میں دسیوں پیوند
سروری ایسی کہ شاہانِ جہاں باج گزار

ہ بھڑک دار کنیزیں نہ طرحدار غلام
تختِ مسجد کی زمیں تاج پرانی دستار

مصاحب نہ محافظ نہ سواری نہ چھتر
فقر کی گود میں پالا ہوا محکم کردار

رزم کے وقت نڈر، شیر دلاور، بے باک
بزم کے وقت کرم پیشہ، رحیم و دلدار
دین و انصاف کے میدان میں تیغِ بُرّاں
پیشِ خلّاقِ جہاں منکسر و زار و نزار

یوں تو آنے کو شہنشاہ بہت سے آئے
فاتحِ مشرق و مغرب ہوئی جن کی تلوار
جن کے نعروں سے دمکتی رہی اسلام کی آن
شہرہ آفاق ہوا جن کا مقدّس کردار
جن کے تیروں نے لیا سینۂ آہن سے خراج
جن کی تیغوں کو ملا سیسہ و فولاد میں بار
لیکن اے دورِ خلافت تری عظمت کی قسم
خواب میں تجھ کو ترستی ہے نگاہِ بیدار

عمل، عمل، عمل

خراجِ عقیدت ادا کرنے والو! خراجِ عقیدت سے کیا کام ہوگا
یہی ہے زبانی محبّت کا عالم، تو دینِ ھدیٰ اور بدنام ہوگا
اگر سن سکو تم تو روحِ محمدؐ خراجِ اطاعت کی طالب ہے، تم سے
یہی ہے جو قول و عمل کی دورنگی، بہت دردانگیز انجام ہوگا
فقط خوش بیانی کے جوہر دکھا کر کوئی قوم دنیا میں ابھری نہیں ہے
عمل چھوڑ کر، صرف باتیں بنا کر کوئی قوم دنیا میں ابھری نہیں ہے
یہ سچ ہے کہ میلاد و سیرت کے جلسے بظاہر ہیں بامِ سعادت کے زینے
یہ سچ ہے کہ نعتِ محمدؐ کے موتی ہیں ایمان کی انگشتری کے نگینے
مگر اے قصیدہ گرو یہ تو سوچو! کہ بے رُوح لفظوں کی قیمت ہی کیا ہے
بنے ہیں کہیں نقشِ آبِ رواں پر، چلے ہیں کہیں خشکیوں میں سفینے
نبی کی حیاتِ مقدس کو دیکھو، ملے گی سراپا جہادِ مسلسل
وفا کی صلابت میں فولاد و آہن، کرم کی لطافت میں رحمت مکمل
یہ سوچو کہ نورِ ہدایت کا پرچم، جنابِ محمدؐ نے کیسے اُڑایا
یہ سوچو کہ دبتوں کو کیسے اُبھارا، یہ سوچو کہ گرتوں کو کیسے اٹھایا
یہ سوچو کہ کیا چیز تھی جس کے بل پر خدا کے اکیلے پیمبرؐ نے اٹھ کر
الٹ دی تھی ایوانِ رُوما کی مسند، پلٹ دی تھی صحرانشینوں کی کایا
یہی نا کہ اس بندۂ باصفا نے جلایا چراغِ جہاد و عزیمت
یہی نا کہ میدانِ سعی و طلب میں نہ چھوڑا کبھی دامنِ استقامت

یہی ناکہ سارے زمانے سے کٹ کر اٹھایا خدا کی اطاعت کا پرچم
ہدایت کا دین اور سعادت کا پرچم، وفا کا حقیقی محبت کا پرچم
وہ بدر و حنین و تبوک و احد کا، جفا کوش، جانباز، یکتا مجاہد
وہ تھا جس کے مضبوط دستِ عمل میں، جہاں سے نرالی شجاعت کا پرچم
وہ جرأت سراپا، وہ ہمّت مجسّم، وہ راتوں کا عابد وہ دن کا سپاہی
وہ جس نے سیاست کی زلفیں سنواریں، وہ جس نے فقیری میں کی بادشاہی
اگر اس سے کچھ بھی عقیدت ہے تم کو، تو اپنا وطیرہ بدلنا پڑے گا
نفاقِ زبان و عمل سے گزر کر صداقت کے سانچے میں ڈھلنا پڑے گا
خبر دے رہا ہے محمدؐ کا اُسوہ، کہ آساں نہیں ہے مسلمان ہونا
بہت امتحانات درپیش ہوں گے، بہت سخت راہوں پہ چلنا پڑے گا
وہ شعبِ ابی طالب و شہرِ طائف برابر صدا پر صدا دے رہے ہیں
وہ مکّہ کی خاکِ مقدّس کے ذرّے، نقوشِ قدم کا پتا دے رہے ہیں
اٹھو مومنو! آج سے عہد کر لو، حبیبِ خدا کی اطاعت کرو گے
عقیدت کے پہلو بہ پہلو عمل سے، حقیقت میں تعمیلِ سنت کرو گے
وہ تابندہ اسلام جو رہ گیا ہے، کتابوں کے اوراق میں دفن ہو کر
وفا کیشیوں سے جفا کوشیوں سے، زمانہ میں اس کی اشاعت کرو گے
یہ ذوقِ اطاعت سے خالی عقیدت، عقیدت نہیں صرف بازیگری ہے
جو ایثار و اقدام سے جی چرائے، محبّت نہیں صرف بازیگری ہے

۱۲/اپریل ۱۹۷۵ء کو پونا کے مشاعرے میں یہ نظم پڑھنے کے دس منٹ بعد
مولانا اس دنیا سے رخصت ہو گئے

جنھیں سحر نگل گئی، وہ خواب ڈھونڈتا ہوں میں
کہاں گئی وہ نیند کی، شراب ڈھونڈتا ہوں میں

مجھے نمک کی کان میں مٹھاس کی تلاش ہے
برہنگی کے شہر میں لباس کی تلاش ہے
وہ برف باریاں ہوئیں کہ پیاس خود ہی بجھ گئی
میں ساغروں کو کیا کروں کہ پیاس کی تلاش ہے

گھرا ہوا ہے ابر ماہتاب ڈھونڈتا ہوں میں
جنھیں سحر نگل گئی، وہ خواب ڈھونڈتا ہوں میں
کہاں گئی وہ نیند کی شراب ڈھونڈتا ہوں میں

جو رک سکے تو روک دو یہ سیل رنگ و نور کا
مری نظر کو چاہیے وہی چراغ دور کا
کھٹک رہی ہے ہر کرن نظر میں خار کی طرح
چھپا دیا ہے تابشوں نے آئنہ شعور کا

نگاہِ شوق جل اٹھی حجاب ڈھونڈتا ہوں میں
جنھیں سحر نگل گئی وہ خواب ڈھونڈتا ہوں میں
کہاں گئی وہ نیند کی شراب ڈھونڈتا ہوں میں

یہ دھوپ زرد زرد سی یہ چاندنی دھواں دھواں
یہ طلعتیں بجھی بجھی، یہ داغ داغ —— کہکشاں
یہ سُرخ سُرخ پھول ہیں کہ زخم ہیں بہار کے
یہ اوس کی پھوار ہیں، کہ رو رہا ہے آسماں

دل و نظر کے موتیوں کی آب ڈھونڈتا ہوں میں
جنھیں سحر نگل گئی وہ خواب ڈھونڈتا ہوں میں
کہاں گئی وہ نیند کی شراب ڈھونڈتا ہوں میں

یہ تلخ تلخ راحتیں، جراحتیں لیے ہوئے
یہ خونچکاں لطافتیں کثافتیں لیے ہوئے
یہ تار تار پیرہن —— عروسۂ بہار کا
یہ خندہ زن صداقتیں قیامتیں لیے ہوئے

زمین کی تہوں میں آفتاب ڈھونڈتا ہوں میں
جنھیں سحر نگل گئی وہ خواب ڈھونڈتا ہوں میں
کہاں گئی وہ نیند کی شراب ڈھونڈتا ہوں میں

جو مرحلوں میں ساتھ تھے وہ منزلوں پہ چھُٹ گئے
جو رات میں لٹے نہ تھے وہ دوپہر میں لُٹ گئے
مگن تھا میں کہ پیار کے بہت سے گیت گاؤں گا
زبان گنگ ہو گئی، گلے میں گیت گھُٹ گئے

کٹی ہوئی ہیں انگلیاں رباب ڈھونڈتا ہوں میں
جنھیں سحر نگل گئی وہ خواب ڈھونڈتا ہوں میں
کہاں گئی وہ نیند کی شراب ڈھونڈتا ہوں میں

یہ کتنے پھول ٹوٹ کر بکھر گئے ——— یہ کیا ہوا
یہ کتنے پھول شاخچوں پہ مر گئے یہ کیا ہوا
بڑھی جو تیز روشنی، چمک اُٹھی روش روش
مگر لہو کے داغ بھی اُبھر گئے یہ کیا ہوا

انھیں چھپاؤں کس طرح نقاب ڈھونڈتا ہوں میں
جنھیں سحر نگل گئی، وہ خواب ڈھونڈتا ہوں میں
کہاں گئی وہ نیند کی شراب ڈھونڈتا ہوں میں

خوشا وہ دورِ بےخودی ——— کہ جستجوئے یار تھی
جو درد میں سرور تھا تو بےکلی قرار تھی
کسی نے زہرِ غم دیا تو مسکرا کے پی گئے
تڑپ میں بھی سکوں نہ تھا، خلش بھی سازگار تھی

حیاتِ شوق کا وہی سراب ڈھونڈتا ہوں میں
جنھیں سحر نگل گئی وہ خواب ڈھونڈتا ہوں میں
کہاں گئی وہ نیند کی شراب ڈھونڈتا ہوں میں

خلوصِ بےشعور کی ——— وہ زود اعتباریاں
وہ شوقِ سادہ لوح کی حسین خامکاریاں
نئی سحر کے خال و خد، نگاہ میں بسے ہوئے
خیال ہی خیال میں، وہ حاشیہ نگاریاں

جو دے گیا فریب وہ، شباب ڈھونڈتا ہوں میں
جنھیں سحر نگل گئی وہ خواب ڈھونڈتا ہوں میں
کہاں گئی وہ نیند کی شراب ڈھونڈتا ہوں میں

وہ لعل و لب کے تذکرے، وہ زلف و رُخ کے زمزمے
وہ کاروبارِ آرزو ـــــــ وہ ولولے، وہ ہمہمے
دل و نظر کی جان تھا وہ دَور جو گزر گیا
نہ اب کسی سے دل لگے نہ اب کہیں نظر جمے
سمندِ وقت جا چکا رکاب ڈھونڈتا ہوں میں
جنہیں سحر نگل گئی وہ خواب ڈھونڈتا ہوں میں
کہاں گئی وہ نیند کی شراب ڈھونڈتا ہوں میں

نہ عشق باادب رہا، نہ حُسن میں حیا رہی
ہوس کی دھوم دھام ہے نگر نگر، گلی گلی
قدم قدم کھلے ہوئے ہیں مکر و فن کے مدرسے
مگر یہ میری سادگی تو دیکھیے کہ آج بھی
وفا کی درس گاہوں کا نصاب ڈھونڈتا ہوں میں
جنہیں سحر نگل گئی وہ خواب ڈھونڈتا ہوں میں
کہاں گئی وہ نیند کی شراب ڈھونڈتا ہوں میں

بہت دلوں میں راستہ حریم ناز کا ملا
مگر حریمِ ناز تک پہنچ گئے تو کیا ملا
مرے سفر کے ساتھیو! تمھیں سے پوچھتا ہوں میں
بتاؤ کیا صنم ملے، بتاؤ کیا خدا ملا
جواب چاہیے مجھے جواب ڈھونڈتا ہوں میں
جنہیں سحر نگل گئی وہ خواب ڈھونڈتا ہوں میں
کہاں گئی وہ نیند کی شراب ڈھونڈتا ہوں میں
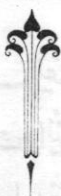
الیکشن نامہ

مجھ سے اے دوست! الیکشن کی حکایت مت پوچھ
کیا گزر جاتی ہے دو دن میں قیامت مت پوچھ

یہ الیکشن کے مجاہد، یہ خطیبانِ کرام
قوم کے عشق میں ہے جن کے لیے چین حرام
جن کے ہونٹوں پہ ہیں اصلاح کے اونچے دعوے
کھائے جاتی ہے جنھیں حُبِّ وطن، فکرِ عوام

ان کی تولید کا موسم ہے الیکشن اے دوست
فصلِ حُبّ الوطنی، عشق کا سیزن اے دوست

لے وہ تیّار ہیں وعدوں کے فلک بوس محل
لے وہ انصاف برسنے کو ہے گرجے بادل
لے وہ بے کاری و افلاس نے دم توڑ دیا
لے وہ لہرائے نئی صُبح کے رنگیں آنچل

حُسن برسنے کو ہے غربت کے شبستانوں میں
جھونپڑے سارے بدل جائیں گے ایوانوں میں

چار سمتوں سے اٹھا اپنی ہی تعریف کا غل
باتوں باتوں میں بندھے خدمت و ایثار کے پُل
لومڑی صاف یہ کہتی ہے کہ ہوں شیرِ ببر
اور زاغوں کو یہ دعویٰ ہے کہ ہوں میں بلبل

قوم کے درد سے پھٹتے ہیں کلیجے کتنے
غم کی بھٹی سے تپے جاتے ہیں بھیجے کتنے

جن بچاروں کو کبھی غم سے سروکار نہ تھا
جن کے کاندھوں پہ مشقت کا کوئی بار نہ تھا
بال بچّوں کے لیے ــــــ رزق کمانے کے سوا
جن کے حصّے میں جہاں کا کوئی آزار نہ تھا

آج وہ ــــــ درد کی تصویر بنے پھرتے ہیں
ملک اور قوم کی تقدیر بنے پھرتے ہیں

عمر بھر جن کو رہی خدمتِ انسان سے لاگ
نہ جلی جن کے دلوں میں کبھی احساس کی آگ
جن کے کردار کی پستی نے ــــــ ہمیشہ لوٹا
رحم و انصاف و رواداری و مذہب کا سہاگ

آج دعویٰ ہے انھیں صاحبِ کردار ہیں ہم
لیلیٰ قوم کی الفت میں گرفتار ہیں ہم

جن کے ہر فکر کا محور تھے ــــــ فقط کام و دہن
جن کے جسموں کو گراں ہوتی تھی بستر کی شکن

فرشِ مخمل کے سوا اور کہیں چلنے سے
جن کے تلوؤں میں بڑے زور کی ہوتی تھی چبھن
آج سڑکوں پہ وہ پیدل ہی چلے جاتے ہیں
آتشِ جذبۂ خدمت سے جلے جاتے ہیں

ہائے یہ پھول سے چہروں پہ غمِ قوم کی گرد
اُف یہ بارِ غمِ خدمت سے لچکتے ہوئے مرد
ہائے یہ قوم کے دُکھ درد کا ظالم احساس
ہائے بیتاب نگاہوں میں یہ افسانۂ درد
کچھ نہ پوچھو کہ بڑی سخت گھڑی آئی ہے
آج ناگفتہ بہت ـــــ حالِ تمنّائی ہے

جس نے جتنا بھی کیا مکر کا طوّمار بہم
لے گیا چھین کے وہ فتح کا زرّیں پرچم
"اُسپِ تازی شدہ مجروح ـــــ بزیرِ پالان"
"طوقِ زرّیں ہمہ در گردنِ خرمی بینم"
دُکھ پڑوسی کا بھی کل تک جسے معلوم نہ تھا
خیر سے آج ـــــ نمائندۂ جمہور ہوا

دوڑتے دوڑتے پیروں میں پڑے ہیں چھالے
قوم کے عشق میں سارے ہی جتن کر ڈالے
نوٹ اور ووٹ میں کچھ فرق نہیں ہے ایسا
صرف اک حرف بدلتے ہیں بدلنے والے

ایک ہی چیز سیاست بھی تجارت بھی ہے
مفتیِ وقت یہ کہتا ہے عبادت بھی ہے

آج تو ایک بلانوش بھی مسجد میں گیا
جا کے سجدے میں گرا اگر کے خدا سے یہ کہا
اے خدا قوم سے ووٹوں کی تو ہے کم اُمّید
تو ہی کچھ غیب کے پردے سے کرشمہ دکھلا

تیری قدرت تو وہ ہے، جس کی نہ حد ہے نہ حساب
تو جو چاہے تو اٹھے، سینۂ صحرا سے حباب

صرف اک بار جتا دے، تجھے اپنی ہی قسم
ممبری مجھ کو دلا دے ——— تجھے اپنی ہی قسم
کل مجھے آتشِ دوزخ میں بھی جلنا منظور
آج کرسی پہ بٹھا دے تجھے اپنی ہی قسم

میں بھی ہوں تیرا ہی بندہ مرے پیارے مولا
اپنے محبوب کا صدقہ ——— مرے پیارے مولا

سیٹھ جگدیش بھی مندر میں نظر آتے ہیں
اور دیوی کے چرن چھو کے یوں فرماتے ہیں
آج ہم پہلے پہل آئے ہیں بنتی لے کر
تیرے چرنوں کے لیے پھولوں کی تھالی لے کر

تیرے ہونے پہ الیکشن کا ٹکٹ لے بیٹھے
قوم کے ہاتھ میں، اپنا ہی گلا دے بیٹھے

اب ہے ہر سانس میں گمبھیر خیالوں کا ہجوم
کون ہے مدِّ مقابِل ــــ یہ تجھے ہے معلوم
وہی چپڑوا ہے کی اولاد منوہر کم ذات
اور جنتا میں مچی ہے اسی کم بخت کی دھوم

ہائے کیا اب بھی تجھے لاج نہیں آئے گی
ہم اگر ہار گئے، ناک ہی کٹ جائے گی

تو جتن کر کے مسیتا بھی ــــ ٹکٹ لے آیا
حُقّہ پیتے ہوئے اُس نے بھی یہ ارشاد کیا
لوگ عزّت سے کہیں شیخ مسیتا مجھ کو
پاس نزدیک کی جنتا مجھے سمجھے نیتا

دس بگھہ ایکھ میں ــــ بیوپار یہ مہنگا تو نہیں
ہار بھی جاؤں تو کچھ میرا بگڑتا تو نہیں

ایک دیوی بھی اکھاڑے میں اُتر آئی ہیں
خنجرِ غمزۂ و پیکانِ ادا ــــ لائی ہیں
ان کے جلسے میں کئی لوگوں نے فقرے بھی کسے
چشمِ بد دور ــــ نہ سہمی ہیں نہ شرمائی ہیں

ناز و انداز بلا کے تو غضب کی تقریر
نوجواں نسل کے خوابوں کی مجسّم تعبیر

لوگ کہتے ہیں کہ روٹی جو نہیں کچھ بھی نہیں
دال بازار میں سستی جو نہیں کچھ بھی نہیں
ہے مگر قوم کے لیڈر کا یہ ارشادِ عظیم
اپنی تقدیر میں کرسی جو نہیں کچھ بھی نہیں

جھوٹ، بہتان، دغا، وعدہ خلافی کیا ہے
قوم سے عشق ہے اور عشق میں سب چلتا ہے

جشنِ آزادی کے موقعے پر

کتنا ہی سجا لے محفل کو اے دوست یہ جشنِ عام نہیں
جس جشن میں ناداروں کے لیے، راحت کا کوئی پیغام نہیں

جس بادہ کی مستی، دل توڑے، جس جام سے رُوحیں گھائل ہوں
وہ تازہ لہو ہے بادہ نہیں، وہ کاسۂ سر ہے جام نہیں

برسوں کی مسلسل محنت کا، انعام تو پایا ہے لیکن
مزدور کو جس کی خواہش تھی، افسوس یہ وہ انعام نہیں

فریاد کے صدہا دُکھیارے، بے گھر ہیں پڑے ہیں راہوں میں
جاڑوں میں ٹھٹھر، گرمی میں تپش، برسات میں سقف و بام نہیں

غیروں کی حکومت تھی جب بھی، مفلس کے لیے آرام نہ تھا
اپنوں کی حکومت ہے اب بھی، مفلس کے لیے آرام نہیں

حق یہ ہے کہ وہ حق دار نہیں جنتا پہ حکومت کرنے کے
جن تخت نشینوں کو حاصل، ہمدردیٔ خاص و عام نہیں

ہم جشن تو اس دن سمجھیں گے، جب چین ملے گا غربت کو
تقسیم غلط ہے دولت کی، ـــــ زردار ابھی ناکام نہیں

ہیں مکر و سیاست کے سودے، کردار و عمل کی منڈی میں
کہتے ہیں جسے اخلاص و وفا، اُس جنس کا کوئی دام نہیں

آزادیٔ کامل بھی عام، پابند ہے کچھ قانونوں کی
ہر قید چمن سے آزادی، آزادیٔ نیک انجام نہیں

سینما گرل

ایک لڑکی حسن و رعنائی کا نقش بے مثال
دورِ حاضر کی ترقی یافتہ، روشن خیال
شاہدِ مغرب کی ہر اندازِ دل کش کی غلام
تن فروشی کے مہذّب راستوں پر تیز گام

جان و دل سے زینتِ رُخسار و گیسو پر نثار
بے نیازِ فکرِ دولت، دخترِ سرمایہ دار
مشرقی تہذیب کو خوار و زبوں سمجھے ہوئے
دین و مذہب کو غریبوں کا جنوں سمجھے ہوئے

زندہ دل زندہ نظر، عشوہ طراز و خوبرُو
یعنی کالج کے پری زادوں کی جانِ آرزو
جامہ زیبی کو اصولِ ارتقا کہتی تھی وہ
رات دن فیشن پرستی میں مگن رہتی تھی وہ

پارٹی، تھیئٹر، سینما روز کا معمول تھا
خانہ داری کا پرانا ڈھنگ نامقبول تھا
ہاکی و ٹینس میں لہراتی تھی بجلی کی طرح
محفلوں میں رقص فرماتی تھی تتلی کی طرح

سر پھرے ماں باپ، دولت کے نشے میں چور تھے
حال و مستقبل کے اندیشوں سے کوسوں دور تھے

ایک دن جب منعقد تھی دوستوں کی انجمن
وہ مخاطب کر کے سب سے یوں ہوئی گرمِ سخن

مدّتوں سے میری خواہش ہے اداکارہ بنوں
آسمانِ فلم کا ضو ناک سیّارہ بنوں

آرٹ کی خدمت کروں سوسائٹی میں نام ہو
نت نئی رنگینیوں میں میری صبح و شام ہو

قابلِ صد رشک ہے ماہر اداکاروں کا حال
صاحبِ علم و ہنر، باریک بیں شیریں مقال

راحتیں ان کی کنیزیں، سیم و زر انکے غلام
ہر گلی میں ان کے چرچے، ہر زباں پر انکے نام

ان کی دنیا حسن و طلعت، کیف و مستی رنگ و بو
ہر خوشی کو ان کا دامن —— چومنے کی آرزو

قیمتی کاریں، منوّر کوٹھیاں، رنگیں لباس
بے نیازِ رنج و غم، ناواقفِ اندوہ و یاس

زندگی کے مقصدِ زرّیں کو پہچانے ہوئے
ارتقائے علم و فن کے راستے جانے ہوئے

اُن کے آگے ایک لعنت ہے ہماری زندگی
بے مزا، بے کیف، سونی، غم کی ماری زندگی

حسن اک بیکار سی شے ہے نمائش کے بغیر
علم وفن بے سود ہیں مدح و ستائش کے بغیر
جو نہ کچھ فتنے اٹھائے، وہ جوانی ہی نہیں
جو اندھیرے میں بسر ہو، زندگانی ہی نہیں

میں یقیناً فلم کی، بزمِ طرب میں جاؤں گی
آرٹ کی تخلیق سے لوگوں کے دل گرماؤں گی
دوستو! میں پوچھتی ہوں آپکی ہے رائے کیا؟
سب بیک آواز بولے مرحبا، صد مرحبا

آپ اس دُنیائے کیف و نور میں جائیں ضرور
طبقۂ نسواں کو سیدھی راہ دکھلائیں ضرور
حُسن کا خلوت نشیں رہنا ہے سودائے کہُن
شمع کیا وہ جس سے ضو پائے نہ طاقِ انجمن

پھول جو کونے میں کِھل کر رہ گیا بے کار ہے
پھول وہ ہے جو نگاہوں کے گلے کا ہار ہے
ہر زبانِ شوق پر ہوگا فسانہ آپ کا
ملک بھر میں گونج اٹھے گا ترانہ آپ کا

آپ کی ہر ہر ادا بن جائے گی اک شاہ کار
اونچے حلقوں میں بڑھے گا آپ کا عزّ و وقار
نوجواں احباب کی تائید اور ترغیب سے
طائرِ امّید کو تازہ سہارے مل گئے

یہ قدم قدم بلائیں

ایک دن جب صُبح کے رُخ پہ تھا غازہ رات کا
نور کی تربت پہ رکھا تھا جنازہ رات کا
نیّرِ تاباں کے جلوے، مسکرانے ہی کو تھے
مضمحل ننھے ستارے ڈوب جانے ہی کو تھے

وہ اٹھی، ہر سمت ڈالی ایک ذُو معنیٰ نظر
کر چکی تھی رات میں تیار سامانِ سفر
گھر سے نکلی سوئے اسٹیشن ــــ روانہ ہو گئی
شوق کے اسٹیج پر رقصاں تھا شہرِ بمبئی

بمبئی وہ، ایک محشر آفریں ہنگامہ زار
زیر دستوں کا جہنّم جنّتِ سرمایہ دار
جگمگاتی ظلمتوں کی ــــ گود کا پالا ہوا
مغربی تہذیب کی ٹکسال میں ڈھالا ہوا

جس جگہ مکر و دغا کی ابتلائیں عام ہیں
معصیت کی سلطنت ہے نیکیاں بدنام ہیں
کوڑیوں کے مول بکتے ہیں جہاں علم و ہنر
ہر سڑک پر، ہر گلی کوچہ میں، ــــ ہر ہر گام پر

جس جگہ خودداری و اخلاص ہے جنسِ حقیر
شیش محلوں میں جہاں آباد ہیں دل کے فقیر
لعل و لب پر ہیں جہاں ظاہر فریبی کے نقاب
جس کا ناموسِ تمدّن ہے سراب اندر سراب

ہے جہاں عُریانیوں کا نام — تزئینِ جمال
جس جگہ بے آبروئی کو سمجھتے ہیں — کمال

جب یہاں پہنچی وہ افسونِ تخیّل کی شکار
جاگتی آنکھوں میں آسودہ تھی خوابوں کی بہار

شوق کی طغیانیوں میں غرق تھے روح و دماغ
دیدۂ و دل میں فروزاں تھے امنگوں کے چراغ

خندہ فرما تھی جوانی، ولولے تھے جوش میں
آ کے ٹھہری ایک ہوٹل کے حسیں آغوش میں

دل کے پیمانے میں تھی ہر چند جرأت کی شراب
خندہ زن تھے شرمِ نسوانی پہ آزادی کے خواب

تھا یقیں یہ بھی کہ ارمانوں کی منزل آ گئی
کشتیِ ذوقِ حسیں، نزدیک ساحل آ گئی

حسنِ وارفتہ کے بل بوتے پہ تھی ہمّت بحال
تھا مگر احساسِ تنہائی گراں بارِ خیال

اجنبی تھی، جاننے والا — یہاں کوئی نہ تھا
رازِ دل پہچاننے والا — یہاں کوئی نہ تھا

رفتہ رفتہ جاننے والے بھی پیدا ہو گئے
رازِ دل پہچاننے والے بھی پیدا ہو گئے

تاڑنے والی نگاہوں نے کمانیں کھینچ لیں
خون پی کر جو نہ مانیں وہ سنانیں کھینچ لیں

شمع کی جانب بڑھے، بے تاب پروانوں کے غول
مکر کے بازار میں ــــ ہونے لگے لفظوں کے مول
ایک صاحب ذی حشم ذی مرتبہ ذی اقتدار
اپنے لفظوں میں بڑے تاجر، بڑے سرمایہ دار
دوسرے صاحب خوشامد کے ہنر میں لاجواب
حُسن و الفت کا قصیدہ جن کا رومانی شباب
تیسرے صاحب دیارِ شاعری کے بادشاہ
خوش ادا، خوش فکر، خوش اطوار، فرخندہ نگاہ
سیکڑوں ایسے ہی عالی مرتبہ ــــ عالی مقام
نفسِ آوارہ کے بندے، حرص و خواہش کے غلام
اور ان ابلیس زادوں کے ہجومِ عام میں
سرپھری دوشیزگی، حیوانیت کے دام میں
سایۂ راحت کو، ــــ اصلِ زندگی سمجھے ہوئے
غم کے نادیدہ حجابوں کو خوشی سمجھے ہوئے
رات دن کی اہمیت، اک بےخودی اک انہماک
سر برہنہ، آبرو ہر راہِ آزادی کی خاک
کس کا مذہب، کس کی عقبیٰ، کس کا کعبہ، کس کا دیر
حرفِ بالا پار کی تفریح، چوپاٹی کی سیر
سبز باغوں کی فضائیں، عاقبت بینی حرام
مطمحِ قلب و نظر، تہذیبِ نو کا اہتمام

بھول کر آیا اگر چھوڑے ہوئے گھر کا خیال
بُن دیے معصوم عیّاری نے تاویلوں کے جال
یوں ہی پاسِ عزّت و ناموس کم ہوتا گیا
تیغِ عصیاں سے حیا کا سر قلم ہوتا گیا

گفتگو کی شرم، نظروں کی جھجک جاتی رہی
رُوح کی تابانیوں پر ــــ تیرگی چھاتی رہی
نیرِّ ایمان و دیں ــــــ گھٹتا رہا گھٹتا رہا
دامنِ معصومیت ـــــ پھٹتا رہا پھٹتا رہا

ایک ہرنی اور قزّاقوں کا انبوہِ کثیر
ہر شکاری طاق پر، صیّاد خود اپنی نظیر
اس پہ طُرّہ یہ کہ ان غارت گروں کے جسم پر
مکر کے ہاتھوں نے پہنایا تھا ملبوسِ خضر

کس طرح ممکن تھی اس ماحولِ نازک میں اماں
پھٹ پڑی تھیں بے سہارا ناؤ پر طغیانیاں
نبھنے والا تھا کہاں تک، زہد و بدمستی کا ساتھ
انگلیوں سے خود بخود آتا گیا پہنچے پہ ہاتھ

کرنے والے کر گئے، عصمت کا دامن داغ دار
چل گیا جبر و سیاست کا فریبِ زرنگار
کنجِ خاموشی کی تنہائی صدا دینے لگی
سانس کی تیزی غلاظت کو ہوا دینے لگی

چوٹ کھا کر ——— خون ٹپکانے لگی چشمِ ضمیر
روحِ عصمت میں ترو تازہ ہوا عفّت کا تیر

اور جب دلدل میں پھنس جاتے ہیں انساں کے قدم
پھر کہاں مجبور قدموں کے لیے ——— امکانِ رَم

پائے لغزیدہ پہ جب کھُل جاتی ہے راہِ گناہ
غلطیوں سے آدمی کرتا ہے غلطی کا نباہ

راہ گُم کردہ قدم کیچڑ میں دھنستے ہی گئے
نرم و نازک بال و پر، لاشے میں پھنستے ہی گئے

کُند ہوتی ہی گئی شمشیرِ احساسِ لطیف
ماند پڑتا ہی گیا ——— خورشیدِ ایمانِ ضعیف

بے طرح جب ہو چکی روشن خیالی کی ہدف
آخر آخر رُخ کیا پھر اپنے مقصد کی طرف

بن سنور کر ایک لائق ڈائرکٹر سے ملی
ارتقاء کے رہنما شہرت کے لیڈر سے ملی

تھے معاون تربیت پائے ہوئے حسن و شباب
بارگاہِ فلم میں کیسے نہ ہوتے کامیاب

ڈائرکٹر نے یہ فرمایا بصد لطف و کرم
آپ کی خدمت گزاری کے لیے حاضر ہیں ہم

اس جگہ کو گھر سمجھیے شوق سے کیجے قیام
پا ہی لیں گی راہِ شہرت میں کوئی اونچا مقام

رفتہ رفتہ ـــــ سیکھ جائیں گی اداکاری کا فن
پھولتا پھلتا رہے گا عیش و راحت کا چمن

مختصر باتوں میں سارا مسئلہ طے ہو گیا
سخت مشکل ابتدائی مرحلہ طے ہو گیا

کمپنی میں ایک کمرہ مل گیا بہرِ قیام
ہو گیا آرام و آسائش کا پورا انتظام

کیا بیاں ہو شوق سے لبریز دل کی واردات
جگمگا اٹھی فروغِ آرزو سے کائنات

صبح کو جشنِ تعارف شام کو رسمِ طعام
آج تمہیدِ تعلق ـــــ کل مکمّل اہتمام

پردۂ سیمیں پہ دیکھا تھا جنھیں پروانہ وار
بالمشافہ آج وہ شمعیں تھیں جلوہ در کنار

کمپنی کا سارا عملہ ـــــ صاحبِ اخلاق تھا
دوستی کی نفسیاتی جز رسی میں طاق تھا

ہر نگاہِ ملتفت میں تھا پزیرائی کا رنگ
حسن کے لمعات نے پگھلا دیئے تھے خشت و سنگ

جب رہی ہرسل کے لیے جاتی رہیرسل گاہ میں
ڈائرکٹر منتظر ملتے تھے اکثر راہ میں

دید کے قابل تھا پبلسٹی کے آفیسر کا حال
ہر تبسّم، ہر نظر، آئینۂ شوقِ وصال

اور منشی جو کہ تھے ملکِ ادب کے تاجدار
فنِّ افسانہ نویسی میں ——— وحیدِ روزگار
شاعری میں فرد، اسٹوری کی دنیا کے خدا
شاہدِ بزمِ ڈرامہ ——— ثانیِ برنارڈ شا
تھا گُلِ پندار سے مہکا ہوا جن کا چمن
جن کا دعویٰ تھا کہ افسانوں کی چوری بھی ہے فن
اخذ کرتے تھے جو پارینہ فسانوں سے پلاٹ
بے دھڑک بے خوف سی لیتے تھے جو مخمل میں ٹاٹ
آ چلا تھا ان کے چہرے پر بھی رنگِ عرضِ غم
سر بہ سجدہ ہو رہا تھا کان کی لَو پر قلم
یوں ہی دیگر کارپردازانِ بزمِ رنگ و نور
تھے ہوس کے نشّۂ افتادگی سے چُور چُور
ابتداءً اُس نے یہ سمجھا کہ قسمت کی نظر
مہرباں ہے اس کے بے پایاں خلوصِ شوق پر
کھُل گیا لیکن بھرم جلدی ہی اس ماحول کا
ربط ظاہر ہو گیا، بے ربط فعل و قول کا
تہ نشیں جذبات، سطحِ گوش و لب پر آ گئے
مبتذل خطبے سرِ محراب و منبر آ گئے
مل نہیں سکتا، ترقی کا کسی کو راستہ
خالقانِ فلم کی حاصل نہ ہو جب تک رضا

مالکانِ فن کی خوشنودی ضروری ہے یہاں
ہو نہ یہ حاصِل تو، ہر کوشش ادھوری ہے یہاں
کسمسایا پھر ضمیرِ زخم خوردہ ــــ باربار
تھا مگر کس کو ــــــ عنانِ آرزو پر اختیار

تج دیا تھا جس جنونِ شوق پر گھربار کو
کس طرح سے پھونک دے اس شوقِ ناہنجار کو
دل نے سمجھایا کہ رجعت اک خیالِ خام ہے
کیا شرافت، کیا حیا، دنیا اسی کا نام ہے

کوئی دنیا فلم کی دُنیا کے ہم رُتبہ نہیں
یہ وہ سودا ہے، کسی قیمت میں جو مہنگا نہیں
گردنِ تسلیم آخرکار ــــ خم ہو ہی گئی
پا بُریدہ معصیت، ثابت قدم ہو ہی گئی

شاہدِ احساس کی آنکھوں میں زردی آ گئی
شاخ جو پہلے ہی خم دیدہ تھی لچکا کھا گئی
اور اس کے بعد ــــ کیا کہیے کہ کیا ہوتا رہا
ضو فگن ہر سُو ــــ جمالِ ارتقا ہوتا رہا

چند ہی سالوں میں وہ صیدِ فریبِ زندگی
چاند بن کر آسمانِ فلم پر روشن ہوئی
حسبِ خواہش ــــ گوہرِ بحرِ تمنّا مل گیا
آبرو کے مول ہیروئن کا رُتبہ مِل گیا

کوئی کہتا تھا ——— بڑی اونچی اداکارہ ہے یہ
آرٹ کے چرخِ بریں پر صبح کا تارہ ہے یہ
کوئی کہتا تھا شریفانہ ہے اس کی ہر ادا
ہے کسی اونچے گھرانے کی متاعِ بے بہا
کوئی کہتا تھا کہ اب ہو گی ——— ترقی قوم کی
چھوڑ دی ہے عورتوں نے رٹ صلوٰۃ وصوم کی
کوئی اس کی ——— پاکدامانی کی کھاتا تھا قسم
تھی کسی کی ——— چشمِ رُوحانی میں بے حد محترم
کوئی اس کے عشق میں آٹھوں پہر سرشار تھا
کوئی ملکوتی عقیدت کا ——— علم بردار تھا
کوئی لکھتا تھا مکاتیبِ محبّت صُبح و شام
کوئی بادِ صبح کے قاصد کو دیتا تھا پیام
یوں ہی جُل دیتا رہا، آدم کو گندم کا فساد
مغربی تہذیب کے ہاتف نے دی یہ کہہ کے داد
اے کمالِ جرُاتِ خاتونِ مشرق ——— زندہ باد
جنّتِ زلف ولب و ساق وکمر پائندہ باد
عورتوں میں کیا نہیں وہ بات جو مردوں میں ہے
کیا قیامت ہے، یہ جنسِ بے بہا پردوں میں ہے

پسِ منظرِ انقلاب

نگاہِ انساں کو آج فطرت، نئے مناظر دکھا رہی ہے
حریمِ ظُلمت پہ جتنے پردے گرے ہوئے تھے اٹھا رہی ہے

جہانِ کہنہ کے بحر و بر میں ہوا ہے برپا کچھ ایسا عالم
سماعتیں ڈگمگا رہی ہیں، نظر کی لَو تھرتھرا رہی ہے

زمیں پہ اوندھے پڑے ہیں ساغر، اداس و پُر نم ہے چشمِ ساقی
ہوئے ہیں فق میکدوں کے چہرے، شراب کو نیند آ رہی ہے

چمن کے ہونٹوں پہ ہچکیاں ہیں دھڑک رہی ہے گلوں کی چھاتی
خزاں کے دامان و آستیں میں کلی منہ چھپا رہی ہے

دیارِ عالم کے کوچے کوچے سے، سر اٹھایا ہے زلزلوں نے
ہوا ہے شق آسماں کا سینہ، زمیں پچھاڑے سے کھا رہی ہے

یہ قدم قدم بلائیں

پڑی ہیں راہوں میں سرد لاشیں، نہیں کوئی جن کو رونے والا
جہاں پہ ہے ظلمتوں کا پہرہ، فضا لہو میں نہا رہی ہے

فضا میں ہر سو تنے ہوئے ہیں، دھویں کے تاریک شامیانے
زمیں پہ جنگ و جدل کی دیوی بساطِ ماتم بچھا رہی ہے

کہیں سماعت شکن دھماکے، فضا میں حل ہو کے رہ گئے ہیں
کہیں حوادث کی تُند آندھی، نئے شگوفے کھلا رہی ہے

فلک پہ کٹتی تھیں جن کی راتیں وہ منہ کے بل گر کے سو گئے ہیں
جو عیش گاہوں میں سو رہے تھے فضا انھیں گدگدا رہی ہے

وہ بھیڑیے جن کے ناخنوں پر رچی ہوئی تھی لہو کی مہندی
مہیب رُو کرگسوں کی ٹولی انھیں کی لاشوں کو کھا رہی ہے

جو زیست کو جاوداں سمجھ کر گلے دباتے تھے بے کسوں کے
انھیں کی بالیں پہ آج عامرؔ، اجل کھڑی مسکرا رہی ہے

اشارات

سکون عقل کے دامن میں ڈھونڈنے والے
شرابِ مے کدۂ دہریت کے متوالے
ترا شعور مسخّر ہے ـــــ سحرِ باطل سے
پڑے ہوئے ہیں ترے دل کے قصر میں تالے

یہ اقتصاد و معیشت کے فلسفوں کا ہجوم
یہ بزمِ فکر و سیاست میں ازم ازم کی دھوم
یہ مادّی نظریے حسین ـــــ بہت ہیں مگر
نہیں ہے ان میں کوئی آفتاب سب ہیں نجوم

نجوم لاکھ دکھائیں ــــــ کمالِ تابانی
نہ دے سکیں گے کسی شب کو صبحِ نورانی
بہارِ صبح، ضیا بار آفتاب پہ ہے
وہ آفتاب کہ جس کی ضیا ہے وجدانی

فروغِ فلسفۂ اشتراکیت کے نقیب
امامِ لشکرِ جمہوریت ارتقار کے خطیب
بساطِ ظلم اُلٹنے کا اہتمام درست
بجا کہ دیر سے روٹی کے منتظر ہیں غریب

مگر سرودِ ازل کی نوا کچھ اور بھی ہے
حیات نان و شکم کے سوا کچھ اور بھی ہے
اگر خدا پہ تجھے، اعتبار باقی ہے
تو تیرے واسطے حکمِ خدا کچھ اور بھی ہے

شکم کو محورِ ہستی ــــــ سمجھ لیا تو نے
جو صرف جزُ تھا اُسے کل بنا دیا تو نے
سرِ نیاز امانت تھا پائے جاناں کی
اُسے بھی غیر کی چوکھٹ پہ خم کیا تو نے

کبھی نظامِ خلافت پہ ـــــ غور کر نہ سکا
دماغ و روح کی نسبت پہ ـــــ غور کر نہ سکا
زبورِ ہیگل و انجیلِ مارکس بھی دیکھی
رسولِ پاکؐ کی عظمت پہ ـــــ غور کر نہ سکا

خرد کے بل پہ ہوس کا علاج، ـــــ ناممکن
شکستِ کشمکشِ ذلق و تاج ـــــ ناممکن
جلے چراغ نہ جب تک حریمِ باطن میں
ہوائے نفس کا ـــــ مٹ جائے راج ناممکن

جہاں دماغ کے ہمراہ، دل بھی چلتا ہے
وہیں سے خاورِ صبحِ یقیں نکلتا ہے
گماں کی حد میں ہے پروازِ فکرِ انسانی
گماں قدم بہ قدم ـــــ کروٹیں بدلتا ہے

مُستقبل کے دُھندلکے

مرحبا، صنعت و سائنس و تجارت کا کمال   اب یہ دنیا نہیں بیوپار کی اک منڈی
سیم و زر پر ہے یہاں عظمتِ انساں کا مدار   اور انصاف کے پلڑوں کی یہی ڈنڈی

جسم بکتے ہیں، سرِ راہ مزیّن ہو کر   شاہدِ زر کے اشاروں پہ تھرکتے ہیں ض
جنس نیلام ہے، روحیں بھی، دماغ و دل بھی   عشق کے پاؤں میں ہے حرص و ہوس کی ز

زُہد تھا فقر کے اعجاز پہ جس مذہب کو   آج بازار میں بکتا ہے وہ سونے کے عو
بارِ سرمایہ سے قانون لچک جاتا ہے   قہقہے ظلم کے ہونٹوں پہ ہیں رونے کے عو

خوفِ جمہور سے لبریز ہے زردار کا جام   خوب پیتا ہے، مچلتا ہے، بہل جاتا
اور بہکی ہوئی ـــــ رفتار کی ہر ٹھوکر پر   ہڈیاں سینۂ مزدور کی چٹخاتا

حُرمتِ محنت و کاوش ہے، یہاں ناداری   کنکریں پستی ہیں گیہوں میں غریبوں کے
قُمقمے قصرِ امارت کے ہیں تاروں کے حریف   تیل کی بوند سے خالی ہیں غریبوں کے د

غالباً جلد بدل جانے کو ہے یہ کہنہ نظام
وقت کی چاپ میں آہٹ سی ہے طوفانوں کی

برق رَو توسنِ تاریخ ہے دورا ہے پر
اک طرف عدل کی کچلی ہوئی قدروں کا ابھار

یہ بھی ممکن ہے کہ فولاد کی دیواروں سے
بند باندھے تو ہیں سہمی ہوئی زرداری نے

ہے شرربار ہواؤں میں بخاروں کی تپش
افقِ سُرخ سے پھوٹی ہے لہو کی دھارا

ارتقاء رک نہیں سکتا ہے کسی قوّت سے
انقلابات کی منطق کے تقاضے ہیں اٹل

زندگی ایک نئے موڑ پہ آپہنچی ہے
فقر و فاقہ کی گھڑی توڑ پہ آپہنچی ہے

فاقہ کش ایک طرف سیر شکم ایک طرف
بامِ دولت سے برستے ہوئے بم ایک طرف

اور کچھ روز ٹھہر جائیں اُمنڈتے سیلاب
قابلِ دید ہے چڑھتی ہوئی موجوں کا عتاب

وقت کی نبض میں سُرعت بھی صلابت بھی ہے
قہقہہ زن پسِ تعمیر ہلاکت بھی ہے

اس کی یلغار ہے سولاکھ اِٹم بم کی حریف
اسکے حلقے میں جہاں بھر کے عساکر ہیں ضعیف

قطعات

دُھائی

دیوانوں کو اہلِ خرد نے چوراہے پر سولی دی ہے
تھی یہ فردِ جرم کہ اس نے، فرزانوں پر کنکر پھینکا
بارِ الٰہا! تیری دہائی، یہ منصف تو اہلِ نظر ہیں
ان کو خبر ہے سنگِ ملامت، پہلے کس نے کس پر پھینکا

شرم سے گردن جھک جاتی ہے، یہ ان کہنی کیسے کہوں میں
کن کن لوگوں نے چھپ چھپ کر، دور سے مجھ پر پتھر پھینکا
اپنوں ہی کی راہبری تھی جس کے بھروسے نے اکثر
زہر خریدا امرت چھوڑا، کنکر ڈھونڈا، گوہر پھینکا

طعنۂ عصیاں دینے والو! ایک نظر اس پر بھی ڈالو
میری توبہ کے شیشے پر، فطرت نے خود پتھر پھینکا
بے موسم گھر آئے بادل، بن بادل بھی برسا پانی
میں نے جب بھی توبہ کر کے، پینا توڑی ساغر پھینکا

میری نظر میں یہ بھی ساقی، کم نظری ہے بے ادبی ہے
یہ کس نے ٹوٹا ہوا ساغر، میخانے سے باہر پھینکا
مے خواروں کو یہ تو خبر تھی، اس کو تیرا ہاتھ لگا ہے
باہر کی ناپاک زمیں پر، کس دل سے اور کیونکر پھینکا

عام میری تشنہ لبی سے، یوں بھی کھیل کیا ساقی نے
میرے ہی آگے صہبا کو، پیمانے میں بھر بھر پھینکا
میں پھر بھی تاویل ہی کوئی، کر لیتا لیکن ظالم نے
پاس بُلا کر، آس بندھا کر، دکھلا کر جتلا کر پھینکا

درد

یہ سچ ہے شدّتِ غم ہائے زندگانی سے
ملال و درد کی تصویر بن گیا ہوں میں
نہیں رہینِ طلب میرے عجز کا پندار
لبوں پہ آ کے جو رُک جائے وہ دعا ہوں میں

صبحِ صادق

پھیلتا جاتا ہے نورِ صبحِ صادق ہر طرف
بیکراں تاریکیوں کی شمع گُل ہونے کو ہے
اک طرف ملنے لگا پھولوں کو پیغامِ حیات
اک طرف شبنم اجل کی گود میں سونے کو ہے
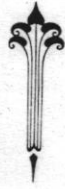
جھُنجھلاہٹ

ناقدریٔ اربابِ ہُنر دیکھ کے میں نے
داوات الٹ دی ہے، قلم توڑ دیا ہے
جب دام لگے بے بصری بے خبری کے
کوزے کی طرح ساغرِ جم توڑ دیا ہے

نازک تو بہت تھی وہ نظر پھر یہ ہوا کیا
تھا مجھ میں اَنا کا جو صنم توڑ دیا ہے
منظر مری وجدان کی آنکھوں نے یہ دیکھا
خود مجھ میں کسی شخص نے دم توڑ دیا ہے

جس در سے غمِ عشق کے نغمات ملے ہیں
لے جا کے وہیں بربطِ غم توڑ دیا ہے
وہ عامرِ بدنام کہ تھا رندِ خرابات
اس نے درِ محبوب پہ دم توڑ دیا ہے
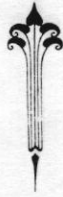
انعامِ تنہائی

کیسے رائیگاں جاتا، میرا صبرِ مظلومی
ہر کسی کے لب تر تھے، میری پیاس تھی تنہا
وقت کے طمانچوں سے، رہ گیا کھنڈر بن کر
مے کدے کو لے ڈوبی میری تشنگی تنہا

رفتہ رفتہ سب ساتھی، ساتھ چھوڑ آئے تھے
دشتِ غم میں کاٹی ہے، میں نے زندگی تنہا
میری موت کا ماتم، دشتِ غم میں کرتا کون؟
پھوٹ پھوٹ کر روئی، میری بے کسی تنہا

بوالہوس سمجھتے کیا، درجۂ شہادت کو
میکدے کی چوکھٹ پر میں نے جان دی تنہا
رند سب رہے محروم، تشنگی کی لذّت سے
پیاس کی مئے کہنہ، صرف میں نے پی تنہا

مولانا شبّیر احمد عثمانیؒ کی وفات پر

وہ ایک تارا جو ضو فگن تھا، حیات کے مغربی اُفق پر
سیاہئ شب کے پاسبانو! خوشی مناؤ کہ وہ بھی ڈوبا
وہ اک سفینہ جو ترجماں تھا، بہت سی غرقاب کشتیوں کا
ہماری حالت پہ ہنسنے والو! ہنسی اُڑاؤ کہ وہ بھی ڈوبا
وہ ایک دل جو دمک رہا تھا، خلوص و ایماں کی تابشوں سے
خلوص و ایماں کے دشمنوں کو، خبر سُناؤ کہ وہ بھی ڈُوبا

حوصلہ

اوس کا ننھّا سا قطرہ ہوں پھولوں میں تُل جاؤں گا
دولت کی میزان میں لیکن، تول نہ پائے گا کوئی
شہر کے ہر شہ زور سے کہہ دو، پوری کوشش کر دیکھے
میرے دستِ طلب کی مٹھی، کھول نہ پائے گا کوئی

افسوس

کوہ کنی ہم سب نے کی تھی، ہیرے بھی ہم سب کو ملے تھے
میرے ساتھی ان ہیروں سے عدل کے شیشے کاٹ رہے ہیں
رنگیں خوابوں کا اک دفتر، ہم سب نے تصنیف کیا تھا
میرے ساتھی اس دفتر کو دیمک بن کر چاٹ رہے ہیں

معتبر کچھ بھی نہیں، زہد نہ تقویٰ نہ وفا
ان کو جب تک تری تصدیق نہ حاصل ہو جائے
یوں تو ہر چیز سے اونچا ہے محبّت کا مقام
شرط یہ ہے تری تائید بھی شامل ہو جائے

یادِ ایّام! کہ اک نور و ضیا کا بادل
بحرِ ظلمت سے اٹھا سارے جہاں پر برسا
ایک ذرّہ تھا مگر مہر کی صورت چمکا
ایک قطرہ تھا مگر بن کے سمندر برسا۔

افسردہ و خموش ہے اسلام کا چراغ
جو نور دے رہا تھا وہ شعلہ ہی کٹ گیا
بتّی ہوس کے تند شراروں نے پھونک دی
جو تیل بچ رہا تھا مزاروں میں بٹ گیا

ظلمتِ عصیاں میں جب دیتی ہے ضو شمعِ ضمیر
اور ہوتا ہے نمایاں دل کے آئینے کا زنگ
یوں ہی جب صحرا کی تاریکی میں جلتا ہے چراغ
اور کچھ گہرا نظر آتا ہے تاریکی کا رنگ

تم کو تقدیر نے ہیرے تو دیے تھے لیکن
تم نے ان ہیروں سے انصاف کے شیشے کاٹے
باغ میں پھول تو ہر سمت کھلے تھے لیکن
تم نے ان پھولوں سے نفرت کے جہنّم پاٹے

خون کی روشنائی سے تحریر تھی، وقت کی لوح پر داستانِ وفا
نوکِ خنجر سے اس کو مٹایا گیا، اب ثبوتِ وفا کس طرح لائیے
کتنے اربابِ ہمّت نے انکے لیے بڑھ کے میدان میں جان بھی ہار دی
اب بھی ان کی نگاہوں میں ہے بدظنی، اب بھی ان کو وفا کی سند چاہیئے

دل کے رِستے ہوئے زخموں پہ گرا کر پردے
تم سمجھتے ہو کہ چھُپ جائے گا بے تاب لہو
ہائے یہ دھول اُڑاتی ہوئی ناکارہ بہار
وائے یہ پھول کہ جن میں نہ کوئی رنگ نہ بو

عزمِ بے باک دیا، رُوحِ تگ و تاز نہ دی
حسنِ آواز دیا ______ گرمیٔ آواز نہ دی
ہائے وہ طائرِ مجبور، جسے قدرت نے
پرِ پرواز دیے، طاقتِ پرواز نہ دی

شعر کا حسن ہے نغمہ یہ مجھے بھی تسلیم
صرف نغمے کو مگر، شعر کا مقصد نہ بنا
لوچ آواز کا تزئین کی حد سے نہ بڑھے
حسنِ آواز کو افکار کا مرقد نہ بنا

صحرا صحرا غم کے بگولے، بستی بستی درد کی آگ
جینے کا ماحول نہیں ہے، لیکن پھر بھی جیتے ہیں
ساغر ساغر زہر گھُلا ہے، قطرہ قطرہ قاتل ہے
یہ سب کچھ معلوم ہے لیکن پیاس لگی ہے پیتے ہیں

طوفانِ ستم کی موجوں میں، ہم ضبط پہ قائم تھے لیکن
اس چشمِ کرم کو کیا کہیے، جو ضبط کی دنیا لوٹ گئی
جس کشتی نے منجدھاروں میں، سیلابوں کے منھ موڑ دیئے
نزدیک پہنچ کر ساحل کے افسوس وہ کشتی ٹوٹ گئی

اسباب و نتائج داخل ہیں فطرت کے اٹل قانونوں میں
جب سورج اُبھرا دن نکلا، جب سورج ڈوبا رات ہوئی
قسمت کا گِلہ کرنے والو، شطرنج کی بازی ہے دنیا
اک چال چلے تو جیت گئے، اک چال چلے تو مات ہوئی

سونے کی سلاخوں نے انھیں توڑ دیا ہے
کچھ لوگ جو ظاہر میں ہمالے کی طرح تھے
مدہوش اُٹھائے گئے مے خانہ کے در سے
حالاں کہ تقدس میں شوالے کی طرح تھے

ہوائے عزّت و شہرت بھی حرصِ دولت بھی
ہمارے دل کے خزانے میں کیا نہیں اے دوست
جنابِ شیخ کا ڈر بھی ہے خوفِ حاکم بھی
فقط نہیں ہے تو خوفِ خدا نہیں اے دوست

قدم قدم کتنے زخم کھا کر، وفا ہوئی فتح یاب لیکن
وفا کا پایا صلہ جو ہم نے، وہ بے وفاؤں کے کام آیا
ہمارے پاس اب دھرا ہی کیا ہے، نہ رختِ جادہ نہ زادِ منزل
جو رہزنوں سے بچا لیا تھا، وہ رہنماؤں کے کام آیا

میں نہ کہا کرتا تھا ساقی، تشنہ لبوں کی آہ نہ لے
پیاس بھی شعلہ بن سکتی ہے، پیاسوں کو ترسانے سے
دیکھ! وہ جل اٹھا میخانہ، دیکھ وہ سُلگے جام و سبو
نکلی تھی پہلی چنگاری، میرے ہی پیمانے سے

اے عشق تری آن پہ، ہم سادہ دلوں نے
سرمایۂ صد لعل گہر ہار دیا ہے
ہونٹوں کی ہنسی، دل کا سکوں روح کی مسکان
جب کچھ نہ بچا پاس تو سر ہار دیا ہے

اگر مزار پہ سورج بھی لا کے رکھ دو گے
اجل نصیب نہ پائے گا روشنی کا سراغ
بھٹک رہے ہیں اندھیروں میں کارواں کتنے
جلا سکو تو جلاؤ صداقتوں کے چراغ

آج تک عظمت انسان کے گن گائے ہیں
اب مگر عظمتِ خلّاق کے گن گائیں گے
ایک مفروضہ ہیں یہ ملک وطن شہر و دیار
ہم فقط، وسعتِ آفاق کے گن گائیں گے

یہ پُر فریب ستارے، یہ بجلیوں کے چراغ
جوابِ جلوۂ خورشید ہو نہیں سکتے
شبِ فراق کا پہلا سا درد و غم ہے وہی
یہ اور بات ہے اب کھل کے رو نہیں سکتے

دامن دامن داغ لہو کے، چتون چتون خون کی پیاس
چہرہ چہرہ بول رہا ہے، معصوموں کا شہر ہے یہ
کوچہ کوچہ طوق و سلاسل، منزل منزل دار و صلیب
اب میں ہی کیا مُنہ سے بولوں مفہوموں کا شہر ہے یہ

کیوں ہوئے قتل ہم پر یہ الزام ہے، قتل جس نے کیا ہے وہی مُدّعی
قاضیٔ وقت نے فیصلہ دے دیا، لاش کو نذرِ زنداں کیا جائے گا
اب عدالت میں یہ بحث چھڑنے کو ہے یہ جو قاتل کو تھوڑی سی زحمت ہوئی
یہ جو خنجر میں ہلکا سا خم آ گیا، اس کا تاوان کس سے لیا جائے گا؟

راہِ وفا میں جب رہ رہ کر، پاؤں کے نیچے کانٹے آئے
کتنے ہی اربابِ عزیمت، ساتھ مرا دے کر پچھتائے
کوئی ذرا یہ ان سے پوچھے، راہ وفا کی آساں کب تھی
اہلِ عزیمت کی راہوں میں، دنیا نے کب پھول بچھائے

رات تو کالی تھی ہی لیکن، رات گزر کر صبح جو آئی
اور گھٹے کم تاب اُجالے، اور بڑھے ظلمات کے سائے
اب میں سحر کے نغمے گا کر، خود کو کب تک دھوکے دُونگا
ہونٹ ہوئے جاتے ہیں زخمی، دل کا یہ عالم بیٹھا جائے

آپ کی راہ میں کیا کیا نہ سہا تھا ہم نے
آپ نے پھر بھی وفادار نہیں مانا تھا
اور جب ہنستے ہوئے کھیل گئے جان پہ ہم
کہہ دیا آپ نے منہ پھیر کے دیوانہ تھا

مری جانبازیوں کے نقش ہیں زنداں سے مقتل تک
وفا کی راہ میں پیہم دیے ہیں امتحاں میں نے
خدا کی شان، میرا سر ہی ننگ آستاں ٹھہرا
بنایا تھا اسی سے آستاں کو آستاں میں نے

کانٹے تو کانٹے ہی ٹھہرے، انگارے ہیں لالۂ و گل
ایسے میں جینا بھی بہت ہے جیسے بھی جی لیتے ہیں
کرب و بلا کے صحراؤں میں، پانی کی اک بوند نہیں
جب شدت کی پیاس لگے ہے آنسو ہی پی لیتے ہیں

تجلّیوں میں حواس گم ہیں، نظر پہ ہے حسن رعب طاری
انھیں سنانا تھا حال کیا کیا، یہ ہوش باقی رہا نہیں ہے
قدم قدم جن کی جستجو تھی، نفس نفس جن کی آرزو تھی
وہ اب نگاہوں کے روبرو ہیں، تو خود ہمارا پتا نہیں ہے

مانا کہ سہانی صبح ہوئی، ظلمت کا فسوں ٹوٹا لیکن
کچھ اشک بداماں پھولوں کو، یہ صبح پیامِ قہر بھی ہے
بھیگی ہوئی صبحِ گلشن کا ہر قطرۂ شبنم ہیرا ہے
لیکن جو زباں سی چھو جائے، اے دوست وہ ہیرا زہر بھی ہے

چاندنی موسمِ گل، مست فضا، باغ و بہار
پھر بھی یہ رات نظر آتی ہے ویران مجھے
جذب ہیں میرے سفینے کی رگوں میں طوفاں
خشک ساحل بھی ہے منجملۂ طوفان مجھے

جو مر چکا تھا اسے کوئی روشنی نہ ملی
اگرچہ قبر پہ ہم نے بہت چراغ جلائے
اسی طرح سے مسرّت کی ضوفگن شمعیں
رہیں گی بے اثر و رائیگاں جو دل مر جائے

تجلّیِ خاص آج بھی ہے، جہاں کے ہر خشک و تر میں رقصاں
مگر ہماری طلب ہے مردہ، ہمیں شعورِ نظر نہیں ہے
وہی ہے قرآں وہی ہے یزداں، وہی ہے کعبہ وہی مدینہ
مگر خلوصِ عمل ہمارا، یقین سے بہرہ ور نہیں ہے

یہ بجا کہ سجدوں کے داغ ہیں جبینوں میں
یہ تو دیکھیے کیا ہے، دل کا حال سینوں میں
میرے کارواں والے بُتکدے تو چھوڑ آئے
ان بتوں کا کیا ہوگا، جو ہیں آستینوں میں

جسے تمیز تھی اے دوست، نور و ظلمت کی
سحر کے جلوۂ کاذب سے مطمئن نہ ہوا
طلوعِ مہر کے چرچے، بہت سُنے لیکن
ہزار ایسے شبستاں ہیں جن میں دن نہ ہوا

سزا یہ دی ہے کہ آنکھوں سے چھین لیں نیندیں
قصور یہ تھا کہ جینے کے خواب دیکھے تھے
کسی نے ریت کے طوفاں میں لا کے چھوڑ دیا
یہ جرم تھا کہ وفا کے سراب دیکھے تھے

نہ شاہد و شراب میں، نہ عیشِ بے حساب میں
دیارِ عشق کے سوا، سکونِ دل کہیں نہیں
بس اب تو چھوڑ ناصحا! یہ وعظ ترکِ عشق کا
ہزار بار کہدیا، نہیں نہیں، نہیں نہیں

اُلجھے ہوئے سانسوں کی گھُٹن کیسے دکھاؤں
اندر جو ہیں زخموں کے چمن کیسے دکھاؤں
یوں شیشۂ دل سنگِ حوادث نے کیا چور
نس نس میں ہے کرچوں کی چبھن کیسے دکھاؤں

دکھلا تو دیے گھاؤ بھی، ناسور بھی لیکن
احساس کے چھالوں کی جلن کیسے دکھاؤں
اے چارہ گرو! کھائی ہیں کچھ بند بھی چوٹیں
بتلاؤ! تمھیں، ان کی دُکھن کیسے دکھاؤں

خود مجھ میں جو اک شخص کبھی قتل ہوا تھا
افسوس کہ حائل ہے بدن کیسے دکھاؤں
احساس کی دہلیز پہ مدّت سے پڑا ہے
اک لاشۂ بے گور و کفن کیسے دکھاؤں

المیہ

روش روش پہ خار ہیں، بہار ہے دھواں دھواں
وہ ڈالیاں سُلگ اٹھیں بنے تھے جن پہ آشیاں
مرے چمن کو ڈس لیا، چمن کے رنگ و بار نے
حقیقتاً حریف ہیں نہ آندھیاں نہ بجلیاں

جھکے صنم کدے میں بھی، حرم میں بھی کہی اذاں
ضرورتاً بدل لیے، ہمارے سر نے آستاں
پری وشوں سے چاہ تھی، بتوں سے رسم وراہ تھی
خدا کا نام بھی لیا، بطورِ زیبِ داستاں

یہاں کسی کو کیا غرض، جلے ہیں کتنے آشیاں
گری ہیں کتنی بجلیاں، اُٹھی ہیں کتنی آندھیاں
یہ خانقاہ کے حرم، یہ صوفیوں کے آشرم
جہادِ زندگی ہے کیا، یہ تذکرہ نہ کر یہاں

ریت پر پانی کا دھوکہ کھا چکا جو چند بار
بارہا اس کو نظر آتا ہے پانی بھی سراب
جس طرح پیہم فریبِ آرزو کھانے کے بعد
آدمی اکثر سمجھتا ہے حقیقت کو بھی خواب

جس طرف اٹھیں نظریں، تو ہی تو نظر آیا
بھولتا سا جاتا ہوں، دیر کیا حرم کیا ہے
تیری ہر مشیّت پر، دل کو مطمئن پایا
میں نشاط کیوں ڈھونڈوں غم ملے تو غم کیا ہے

عمر گزری ہے اسی فکر میں اے شاہِ اُمم
ایک ہی شعر تری شان کے قابل ہو جائے
پیکرِ جرم و خطا، نام ہے جس کا عامؔر
وہ غلاموں کی کسی صف میں تو شامل ہو جائے

دیکھنا ہے یہ عامؔر، کیا ملے گا منزل پر
زادِ راہ کی حد تک فکرِ بیش و کم کیا ہے
میں تو اک مسافر ہوں، بوجھ کم سے کم اچھّا
مجھ کو دولتِ دنیا، کم ملی تو غم کیا ہے

وہ درد و کرب ہو، یا زخمِ خونچکاں اے دوست!
مجھے تو مفت ہے جو کچھ بھی دے دیا تو نے
یہ کم نہیں کہ توجّہ تو ہے مری جانب
زہے نصیب! مرا امتحاں لیا تو نے

رفعتِ آسماں نہ لوں، وسعتِ لامکاں نہ لوں
میں غمِ عشق کے عوض، دولتِ دوجہاں نہ لوں
تری خوشی کے ماسوا، اور ہے رسمِ عشق کیا
تو مجھے آزمائے جا، میں ترا امتحاں نہ لوں

بارہا سورج پہ ہوتا ہے گھٹاؤں کا ہجوم
اور پھر بھی دن کی تابانی فنا ہوتی نہیں
یوں ہی خورشیدِ محبّت کی شعاعِ زرنگار
غم کی تاریکی میں اپنی روشنی کھوتی نہیں

ملک میں جب موجزن ہوتا ہے بحرِ انقلاب
بے نوا جیتے ہیں مر جاتے ہیں اہلِ تاج و تخت
آندھیوں میں جس طرح سبزہ فنا ہوتا نہیں
اور گر جاتے ہیں غش کھا کھا کے قدآور درخت

بے نوا مزدور نے پائی نہ جب راہِ معاش
کرلیا خود اپنے ہاتھوں جامِ ہستی پاش پاش
جیسے کوئی سوختہ قسمت جواری پھاڑ دے
زندگی کے کھیل میں ہاری ہوئی بازی کا تاش

شعورِ دید جب نہ ہو، کہیں نہیں وہ جلوہ گر
شعورِ دید ہو اگر، وہ جلوہ گر کہاں نہیں
رہِ طلب میں ساتھ لے، جنوں کو بھی خرد کو بھی
جنوں امام ہی سہی، خرد بھی رائیگاں نہیں

نہ زہد و تقوی نے یاوری کی، نہ کام کوئی کمال آیا
حساب کے دن یہ سب عمارت، حساب کی ضربتوں نے ڈھا دی
ہمارے دامن میں وہ تو کہیے، کہ تھے ندامت کے چند آنسو
کسی نے ان کو قبول کر کے، ہماری فردِ عمل جلا دی

نظر کی جوت مٹ گئی، شعورِ دید مٹ گیا
وہاں ہوں میں جہاں کوئی، زمین و آسماں نہیں
بتا ہجومِ بے خودی، یہ ہجر ہے کہ وصل ہے
وہ اتنے پاس آ گئے، کہ میں بھی درمیاں نہیں

دھرا کیا ہے کراہوں کے سوا دنیا کے دامن میں
میں کیوں روؤں، مجھے کیا غم اگر تارِ نفس ٹوٹا
مری میّت پہ عالم نوحہ گر ہیں جسم کے قیدی
مگر میں مسکراتا ہوں کہ مُدّت میں قفس ٹوٹا